ہمیں بدلنا ہے اُمت کے نونہالوں کا مزاج
بن تراشے ہوئے ہیرے ہمیں اچھے نہیں لگتے

تعلیم وتربیت
کے
رہنما اُصول

مؤلف
مفتی مہتاب عالم قاسمی

تفصیلات

جملہ حقوق بحق مصنف وناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب: تعلیم وتربیت کے رہنما اصول
مصنف : مفتی مہتاب عالم قاسمی 8434921045
مقام گیدرگنج، ضلع مدھوبنی (بہار)
کمپوزنگ: ابوناصحہ قاسمی
صفحات : ۱۴۲
سن اشاعت: دسمبر ۲۰۱۶ء
تعداد : ۱۱۰۰
طباعت : ہمدم پریس (وقف)، مالیگاؤں 02554-230503
ناشر : مدرسہ مدینۃ العلوم،
شری رامپور ضلع احمد نگر، مہاراشٹر

کتاب ملنے کے پتے

(۱) مدرسہ مدینۃ العلوم، شری رامپور ضلع احمد نگر (مہاراشٹر)
(۲) مدرسہ حنفیہ عربی کالج، جمیلا گیدرگنج، مدھوبنی (بہار)
(۳) کتب خانہ فیاضیہ، گیدرگنج، مدھوبنی (بہار)
(۴) مدینہ مسجد (مرکز)، شری رامپور ضلع احمد نگر (مہاراشٹر)

انتساب

عالم باعمل، صوفیٔ کامل، زہد وتقوی کے علمبردار،
حامی سنت، ماحی بدعت، خطابت کے شہسوار،
حضرت مولانا محمد مخدوم حسین صاحب مفتاحی نوراللہ مرقدہٗ
(خلیفہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ
وبانی مدرسہ مدینۃ العلوم، شری رامپور)
کے نام
اور
میری دادی جان مرحومہ
کے نام
جن کی بے پناہ شفقت ومحبت کے نتیجے میں
کچھ پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہر دو مرحومین کی قبروں کو نور سے بھر دے
اور جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

؎ آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مہتاب عالم قاسمی

بشری کمزوری

انی رأیت انه لا یکتب انسان کتابا فی یومه الا قال فی غده لو غیر هذا لکان أحسن، ولو زید کذا لکان یستحسن ولو قدم هذا لکان من اعظم العبرة وهو دلیل علی استیلاء النقص علی سائر البلد (قاله العماد الاصفهانی فی مقدمه معجم الادباء)

میں نے دیکھا ہے کہ آج جس انسان نے بھی فن تصنیف میں قدم رکھتے ہوئے کوئی بھی کتاب خوب اہتمام سے لکھی ہے تو کل کو کتاب منظر عام پر آنے کے بعد اسے خود اعتراف کرتے ہوئے کہنا پڑا ہے کہ اس مقام پر کوئی تبدیلی کیجاتی تو بہت اچھا ہوتا اگر اضافہ کیا جاتا تو اور اچھا سمجھا جاتا، اگر اس عنوان یا عبارت میں تقدیم وتاخیر کی جاتی تو کس قدر بہتر ہوتا، اگر یہ عبارت نہ ہی ذکر کی جاتی تو کیا ہی خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔

یہ بڑی عبرت کی بات ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ نقص وکمی اور کمزوری جنس بشر پر مکمل طور پر حاوی ہے۔

ابوناصحہ قاسمی، مدھوبنی

فہرست

عناوین	صفحہ نمبر
سخن اولین	9
پیش لفظ	11
کلماتِ تبریک (مفتی ارشاداللہ صاحب قاسمی)	13
کلمات تقریظ	15
اس کو چھٹی نہ ملی	16
تعلیم وتربیت	18
تعلیم کا مفہوم	22
تعلیم کے معنی	23
تعلیم کو محدود اور وسیع مفہوم	23
تعلیم وتربیت پر اثر انداز عوامل	24
گھر بچوں کا قاتل یا مسیحا	24
جدید تعلیمی رجحانات	31
تعلیم کا مقصد	32
طریقہ تعلیم	36
علم نفسیات	41
علم نفسیات سے ناواقفیت کے نقصانات	41
سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں علم نفسیات کا درس	42
حدیث شریف سے علم نفسیات کے چند اصول	44
خود آگاہی	46

حافظہ	50
یاد کرانے کے طریقے اور تدابیر	51
حافظہ کی قسمیں	53
معلم کی شخصیت اور اوصاف	54
معلم کی آواز	56
معلم کی زبان	57
مربی کا رویہ	58
کامیاب استاذ بننے کے چند اصول	59
بچوں کی تربیت	62
والدین اور تربیت	63
ذمہ داریاں	64
بچے کیوں بگڑتے ہیں	65
علاج	66
توجہ اور قسمیں	68
توجہ کے شرائط	69
خارجی شرطیں	70
داخلی شرطیں	71
توجہ کی قسمیں	72
توجہ اور دلچسپی	73
سیکھنا	76
خود کر کے سیکھنا	76

تربیت سے سیکھنا	77
مشاہدہ اور تقلید سے سیکھنا	77
سوجھ بوجھ سے سیکھنا	77
مشروط اضطرار سے سیکھنا	78
سیکھنے کے قوانین	78
سیکھنے میں مہارت	79
مریں گے ہم کتابوں پر	82
بچوں کے سیکھنے کے عمل پر اثر انداز عوامل	87
حاضری کا مسئلہ	89
پھسڈی پن	91
پھسڈی پن کا علاج	92
تکان	93
تکان کا علاج	93
نظام الاوقات	96
احساس برتری وکمتری وکہتری اور احساس برابری	97
بچوں کی تعلیم وتربیت پر گھر اور مدرسہ کا تعاون	101
تعلیمی ہفتہ یا سالانہ جلسہ	101
پروگرام	102
قابل لحاظ امور	103
اسباق اور ان کے پڑھانے کا طریقہ	104
اسباق کی تیاری	104

تیاری کی اہمیت	104
تیاری میں قابل لحاظ امور	105
سبق کی تیاری کے لئے ناگزیر شرائط	106
اسباق کی قسمیں	106
ڈانٹ پھٹکار مار پیٹ کے نقصانات	107
تعمیر شخصیت	108
جسمانی تربیت	111
جسمانی نشوونما کے لئے ضروری چیزیں	112
بچوں کی صحت اور مدرسہ	116
اساتذہ کا ادب	117
اسلام میں تعلیم وتربیت کا مقام	119
تعلیم وتربیت اور مفکرین اسلام	123

سخن اولیں

کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانا اور کچھ تحریر کرنا مجھ جیسے بے بضاعت اور نااہل شخص کے لئے کتنا مشکل امر ہے اس کا صحیح اندازہ احقر کو ہی ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ اس تحریر کا تعلق خصوصاً علمی حلقوں سے ہو جن کی نگاہ دوررس ہر پہلو پر رہتی ہے، وہ تحسین اور تنقید دونوں نظر سے دیکھتے ہیں، مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان تنقید کے ڈر سے کچھ لکھنا ہی چھوڑ دے، اس لئے کہ بہر حال انسان کی کوشش رنگ لاتی ہے، اگر ایک وقت تحریر شکستہ، غیر مرتب، ناقص اور مواد سے خالی ہوتی ہے تو لکھتے لکھتے تحریر میں عمدگی، سلاست اور جلا پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اسی کی تحریر مقبول خاص وعام بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ احساس ہے جس نے نہ تو مجھے پس روی پر مجبور کیا، اور نہ ہی تھک ہار کر بیٹھنے پر آمادہ کیا، بل کہ اس خیال نے میری ہمت افزائی کی کہ جب یہ تحریر حضرات اساتذہ کرام کے پاس پہنچے گی تو خوش ہوں گے، خامیوں کی اصلاح فرمائیں گے، ہمت باندھیں گے اور حوصلہ افزائی فرمائیں گے اسی احساس وخیال کے ساتھ رب کریم کے فضل وکرم کی امید کرتے ہوئے یہ کتاب سپرد خدمت کر رہا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی حد تک اپنے عمل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے مگر چونکہ انسان کا کوئی بھی عمل نقص سے خالی نہیں ہوا کرتا ہے اس لئے یقیناً کچھ فروگذاشتیں ہوئی ہوں گی، اس سلسلے میں احقر کو کم علمی اور ناقص تجربہ پر محمول کرتے ہوئے معذور سمجھیں اور مطلع فرما کر ممنون احسان ہوں تا کہ آئندہ اصلاح ممکن ہو۔

کتاب کی اشاعت کے حوالے سے مخدوم گرامی حضرت مفتی ارشاد اللہ صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ مدینۃ العلوم شری رامپور اور محترم جناب مولانا احمد صاحب مظاہری نائب مہتمم مدرسہ مدینۃ العلوم شری رامپور احقر کی جانب سے بے پناہ شکریے کے مستحق ہیں کہ اول الذکر تو برابر احقر کے ارادوں کو مہمیز کرتے رہے اور کتاب کی تکمیل کے لئے مسلسل اصرار کرتے رہے نیز موصوف محترم نے ہی کتابت وطباعت کی ذمہ داری لے کر احقر کے لئے تمام مشکل راہیں آسان کر دیں، اور مؤخر الذکر نے بھی کتاب کو منظر عام پر لانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، آپ نے نہ صرف یہ کہ پروف ریڈنگ میں احقر کا ہاتھ بٹایا بل کہ کتاب پر بھی از اول تا آخر گہری نظر ڈالی، اور حسب موقع حذف واضافہ کر کے کتاب کی معنوی تحسین وتزئین میں بے پایاں کوشش صرف کی، واقعہ یہ ہے کہ شکریے کہ یہ چند کلمات ان کے تعاون کا صلہ نہیں بن سکتے، حقیقی اجر تو رب کریم ہی اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائے گا، آخر میں دعا ہے کہ حق جل مجدہ تمام محسنین ومعاونین کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے، کتاب ہذا کو شرف قبولیت سے نوازے اور احقر کو بیش از بیش خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین والسلام

مہتاب عالم قاسمی

پیش لفظ

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے،اس کی ادائیگی کی پوری فکر ہونی چاہیے،ورنہ سخت گرفت کا اندیشہ ہے،اس ذمہ داری میں والدین اور اساتذہ کے ساتھ اگرچہ پوری ملت،معاشرہ اور مملکت بھی شریک ہیں،لیکن براہ راست ذمہ داری والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہیں،اس لیے انہیں کو اس ضمن میں سب سے زیادہ فکرمند بھی ہونا چاہیے،خصوصا آج کے حالات میں تو اس طرف غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے،کیوں کہ معمولی سی غفلت نہایت خطرناک نتائج سے دوچار کرسکتی ہے۔

خدا کا شکر ہے صورت حال کی سنگینی کا اب کسی حدتک احساس ہوچلا ہے اور مختلف اداروں اور جماعتوں کی انفرادی واجتماعی کوششوں کے نتیجے میں لوگ اس طرف متوجہ ہورہے ہیں،جو ادارے ٹھٹھر رہے تھے،انہیں تقویت بہم پہنچائی جارہی ہے،جو اپنوں کی سردمہری اور دوسروں کی تنگ نظری کا شکار ہوچکے تھے،انہیں ازسرنو زندہ کیا جارہا ہے،نئے نئے اداروں کا قیام عمل میں آرہا ہے،صباحی وشبینہ مکاتب کھولے جارہے ہیں،غرض زندگی کے کچھ آثار نمایاں ہونے لگے ہیں،ملت کی ضروریات کے لحاظ سے اگرچہ جو کچھ ہورہا ہے وہ بہت ہی کم اور انتہائی ناکافی ہے لیکن جن محدود وسائل وذرائع کے ساتھ اور جن زحمتوں اور دشواریوں میں گھر کر یہ کام انجام پارہا ہے،اسے بسا غنیمت ہی کہا جاسکتا ہے۔

صحیح تعلیم وتربیت کے بندوبست میں یوں تو متعدد دشواریاں آرہی ہیں،لیکن مندرجہ ذیل ان میں خاص ہیں۔

(۱)نئے اداروں کے لیے موزوں اساتذہ نہیں ملتے۔

(۲)جن اساتذہ سے کام لیا جارہا ہے ان کی اکثریت فن تعلیم وتربیت سے ناواقف ہے۔

(۳)بچوں کی تعلیم وتربیت میں والدین کا پورا تعاون حاصل نہیں ہوتا،ادارہ جو کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے عموما اس پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔انہیں مشکلات کو حل کرنے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کو مؤثر بنانے میں مدد دینے کے لئے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے،اس میں بچوں کی نفسیات،تعلیم کے اصول،تدریس کے طریقے،تربیت کے ڈھنگ،مدرسے کے انتظام،تعاون کے حصول کی صورتوں وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ:

(۱)زبان آسان اور سلیس،انداز بیان عام فہم اور شگفتہ ہو۔

(۲)اساتذہ،والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کے لئے یکساں ،دلچسپ اور مفید ہو۔

(۳)تعلیم وتربیت سے متعلق تمام اہم مباحث پر روشنی پڑجائے۔

(۴)ہر مسئلے پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث ہو۔

اہل علم حضرات سے استدعاء ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں محروم نہ رکھیں،اللہ تعالی اس حقیر پیش کش کو قبول فرمائے اور پیش نظر مقصد کے لئے مفید بنائے۔آمین

مہتاب عالم قاسمی،مدھوبنی

کلمات تبریک

از

حضرت مفتی ارشاداللہ صاحب قاسمی مدظلہ العالی

(مہتمم مدرسہ مدینۃ العلوم شری رامپور وصدر جمعیۃ علماء ضلع احمد نگر)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم ،أمابعد !

استاذ ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے بہت عظیم سعادت ہے وجہ سعادت یہ ہے کہ افضل الرسل خاتم النبین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشادگرامی ہے انمابعثت معلما (یعنی مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا) نیز معلم کے لئے احادیث طیبہ میں بے شمار بشارتیں وارد ہیں ،ہر معلم ومعلّمہ کو چاہئے کہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے جن کو اپنا کر وہ حقیقۃ معلم خیر بن سکتا ہے اور صحیح معنی میں ان بشارتوں کا مصداق بن سکتا ہے ،اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے :اساتذہ نیک ،تو طلبہ بھی نیک اساتذہ خود اپنے بڑوں کے قدرداں تو طلبہ خود ان اساتذہ کے قدرداں ،خلاصہ یہ کہ اساتذہ کرام شریعت اور سنت کے پابند ہوں اور اپنے منصب کے قدرداں ہوں اور ان کے اندر شفقت اور خیر خواہی کا پہلو غالب ہو تو ان کے ہاتھوں تربیت پانے والی نسلیں بھی ان ہی صفات حمیدہ کی حامل ہوں گی ،الحمد للہ اسی جذبہ کے تحت کہ استاذ اور معلّمہ اپنے اندر وہ کریمانہ صفات پیدا کریں جو ایک معلم خیر کے شایان شان ہیں ،اسی سلسلے میں تعلیم وتربیت کے رہنما اصول نامی یہ کتاب ہمارے

عزیز مولانا مفتی مہتاب عالم صاحب قاسمی ناظم تعلیمات مدرسہ مدینۃ العلوم شری رامپور زید علمہ وعملہ نے مرتب کی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی مولانا موصوف کی فیض القاری فی حل مشکلات البخاری منظر عام پر آئی ہے اور الحمد للہ مقبول خاص وعام ہوئی ہے ،بندہ نے اس کتاب کو جستہ جستہ مقامات سے دیکھا اور مضامین کی فہرست پر اجمالی نظر ڈالی اور اس کو اساتذہ کی جماعت کے لئے تو بالخصوص اور عام مسلمانوں کے لئے بالعموم بے حد مفید پایا ،اساتذہ اور معلّمین حضرات سے پوری امید رکھتا ہوں کہ وہ اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے ،حق تعالی شانہ سے دعاء ہے کہ مؤلف کتاب اور ان کے دیگر معاونین کی اس کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے اور امت کے لئے اسے ہدایت کا ذریعہ بنائے اور جن بزرگان دین کی کتب سے استفادہ کر کے کتاب ہذا تیار کی گئی ہے اللہ رب العزت ان سب اکابر علماء کو درجات عالیہ سے نوازے ۔آمین

ارشاد اللہ قاسمی

تقریظ

حضرت مولانا مفتی بلال صاحب قاسمی
(استاذ مدرسہ مدینۃ العلوم، شری رامپور ضلع احمد نگر)

پیش نظر رسالہ (تعلیم وتربیت کے رہنما اصول) مؤلفہ حضرت مفتی مہتاب صاحب (معلم مدرسہ مدینۃ العلوم، شری رامپور) کی بے نظیر کاوش ومحنت کا ثمرہ ہے۔ اس رسالہ میں معلم ومتعلّم کو تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے میں جو دشواریاں آتی ہیں، ان تمام دشواریوں کو ایک اچھے انداز میں حل کردیئے ہیں، یہ کتاب معلم اور متعلّم دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید اور نفع بخش ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے زیادہ سے زیادہ نافع اور مقبول بنائے۔ اور موصوف کو آئندہ بھی اس طرح کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔ آمین یارب العالمین

محمد بلال قاسمی
نگراں مکاتب قرآنیہ
۹ ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ

اس کو چھٹی نہ ملی!

بچپن میں کبھی حضرت امام مالکؒ کے شاگرد رشید حضرت یحییٰ محمودی اندلسی اندلس کا بہت مشہور واقعہ پڑھا تھا کہ حضرت یحییٰؒ اپنے زمانہ طالب علمی میں امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ کے درس میں مدینہ منورہ میں بیٹھے تھے کہ باہر سے اچانک ہاتھی آیا، ہاتھی آیا کا شور بلند ہوا، جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتا، اس لئے شور کو سنتے ہی سارے طلبہ اپنا سبق چھوڑ کر ہاتھی دیکھنے کے لئے باہر دوڑ پڑے، لیکن حضرت یحییٰ جن کی عمر تقریباً ۲۸ سال کی تھی، بدستور درجے میں بیٹھے رہے، حضرت امام مالک نے اپنے شاگرد سے پوچھا کیوں یحییٰ! تمہیں ہاتھی نہیں دیکھنا ہے؟ حضرت یحییٰ نے نہایت متانت سے جواب دیا، حضرت! میں اندلس سے یہاں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا، بلکہ علم حدیث حاصل کرنے آیا ہوں، ویسے ہاتھی اندلس میں بھی نہیں ہوتا؛ لیکن حضرت یحییٰ کی قربانی تھی کہ انہوں نے اپنے استاذ سے ایسا استفادہ کیا کہ بلاد مغربیہ میں حضرت امام مالک کی حدیث کی کتاب موطا اتنی عام ہوگئی کہ آج بھی مسلک مالکی کے ماننے والوں کی تعداد بلاد مغربیہ میں سب سے زیادہ ہے، یہ ان کی چھٹی نہ لینے کا ہی نتیجہ ہے، ہر کام قربانی چاہتا ہے اور حصول علم سب سے زیادہ قربانی چاہتا ہے، آج دنیا میں تعلیم کا اتنا زیادہ چرچا ہونے کے باوجود بھی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، اور جسے ہم دانشور کہیں وہ خال خال ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آج زمانہ جس برق رفتاری سے روبہ ترقی ہے اس نے ہر مسلک علم میں صرف تخصص کو ہی نہیں بلکہ پیشہ وارانہ چابک دستی کو بھی جنم دیا ہے، کسی بھی فن میں امتیاز کے حصول کے بغیر زندگی کے سمندر کو سکون واطمینان کے ساتھ پھلانگ پانا بہت مشکل ہے، ٹیکنالوجی کی سرکش راہوار کی باگ پر ہاتھ اور رکاب میں پیر ہونا ضروری ہے، ورنہ یہ گھوڑا ملت کو ایسے کھڈ میں گرا مارے گا کہ شہسوار کو ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا، اس کے لئے ضروری ہے کہ نظام تعلیم، نصاب تعلیم، طالب علم، اساتذہ اور ان کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اردو والوں کا سب سے بڑا رونا یہ ہے کہ ان کے سات کروڑ بچوں کے تعلیمی مستقبل کو سنوارنے اور سمجھنے کے لئے ان کے پاس لٹریچر نہیں کے برابر ہے، زیر نظر تصنیف اسی مقصد کے حصول کی جانب ایک ادنی سی کوشش ہے، سچ مچ ادنی سی، اس سلسلے میں ہمیں نہ کوئی بلند وبانگ دعوی کرنا ہے اور نہ ہی ہم اس کے مجاز ہیں اس سے ایک بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ معمول کے مطابق ہم نے نئی روشنی کا استقبال کرنے کے لئے اپنے ذہنی دریچوں کو کھلا رکھا ہے، آپ کے قیمتی مشوروں کا ہمیشہ انتظار رہے گا تا کہ دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت انہیں شامل اشاعت کیا جا سکے۔

اُٹھاؤ تیشۂ ادراک اہل فکر ذرا
نئے دماغ تراشو نئی صدی کے لئے

تعلیم وتربیت

شادی کے بعد ہر جوڑے کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ جلد اس کی گود ہری ہو، دیر ہوتی ہے تو سوجتن کرتا ہے روتا گڑگڑاتا ہے، دعائیں مانگتا ہے، منتیں مانتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔

خدا خدا کر کے نخل آرزو بارآور ہوتا ہے، دل کی کلی کھلتی ہے اور مانگی مراد پوری ہوتی ہے، اللہ اس کی گود بھرتا اور مسرت کا سامان کرتا ہے، اعزہ خوشی کے شادیانے بجاتے اور احباب ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

بچہ بلاشبہ اپنے ساتھ بے شمار مسرتیں لاتا ہے، اس کے ساتھ گھر میں برکت آتی ہے، اس کی پیاری پیاری صورت اور کامنی سی مورت سب کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، والدین اپنے جگر گوشے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں، غالبا ان کے لئے اس سے بڑی کوئی مسرت نہیں ہوتی، ماں دن کا سکھ اور رات کا چین قربان کر کے بھی خوش رہتی ہے، صورت دیکھتے ہی باپ کی ساری الجھنیں کافور ہو جاتی ہیں، والدین ہی پر کیا موقوف بچوں کے معصوم چہرے اور ان کی بھولی بھالی باتیں کس کا دل موہ نہیں لیتیں، کون ہے جو انہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوش نہیں ہوتا، سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی بچوں کی معصوم حرکتوں پر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے، جنت کے ان پھولوں کے کھلنے سے ہر گھر میں رونق اور ہر چمن میں بہار آجاتی ہے، چاروں طرف مسرت کی ہوائیں چلتی ہیں، خوشبو پھیلاتی اور ہر ایک کو گدگداتی ہیں، پودے لہلہاتے، پرندے چہچہاتے ہیں، کلیاں مسکراتی ہیں اور پھول ہنستے ہیں، غرض ہر طرف فرحت وانبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

بچے کی پیدائش پر یہ غیر معمولی مسرت بلاوجہ نہیں ہے:

(۱) جنت کا یہ پھول صانع حقیقی کی صناعی کا شاہکار اور انمول تحفہ ہے۔

(۲) اس کی وجہ سے گھر میں خیر وبرکت آتی ہے۔

(۳)والدین کے مابین تعلقات استوار اور رشتہ مستحکم رکھنے کا وہ بہترین ذریعہ ہے۔
(۴)اس کے اندر اللہ نے غیر معمولی کشش اور جاذبیت رکھی ہے۔
(۵)اس سے مل کر آنکھیں ٹھنڈی، قلب مطمئن اور غم ہلکا ہو جاتا ہے۔
(۶)اس کی وجہ سے خاندان کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔
(۷)آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہوتا ہے، مستقبل میں اس سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔

ظاہر ہے ایسا بیش بہا تحفہ اور ایسی نعمت غیر مترقبہ پا کر کون بدنصیب مسرور نہ ہوگا، مگر.....مسرتوں کے ساتھ بچہ بے شمار ذمہ داریاں بھی لاتا ہے۔

(۱) خوش دلی سے اس کو پالنا پوسنا۔
(۲) شفقت ومحبت کا برتاؤ کرنا۔
(۳) ہمدردی ودلسوزی سے اسے سکھانا پڑھانا۔
(۴) تدریج سے پسندیدہ عادات ڈلوانا۔
(۵) مختلف مواقع کے آداب بتانا۔
(۶) مہذب طور طریقے سکھانا۔
(۷) عقائد کو نکھارنا، اعمال کو سدھارنا اور اخلاق کو سنوارنا۔
(۸) صحت وعافیت اور ترقی وکامرانی کی فکر کرنا۔

یہ سب وہ اہم ذمہ داریاں ہیں جو بچے کے ضمن میں والدین پر عائد ہوتی ہیں ،شاید ہی کوئی باپ ایسا ہو جسے ان ذمہ داریوں کا احساس نہ ہو اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش نہ رکھتا ہو، اپنی اولاد پر جان چھڑکنا یہ تو ایک فطری تقاضہ ہے، جان بوجھ کر کون غفلت اور کوتاہی کرے گا باپ ہی تو وہ ہستی ہے جو اولاد کو اپنے سے بھی بڑھ کر دیکھنا چاہتی ہے، لیکن ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہیں جن کی یہ تمنا پوری ہوتی ہے اور جو اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہو پاتے ہیں، کیوں کہ تنہا خواہش ہی سے تو سارے کام نہیں بن جاتے، تعلیم وتربیت کے لئے سلیقہ بھی چاہے اور غیر معمولی جدوجہد بھی جب ان میں کمی ہو تو کسی اچھے نتیجے کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے۔

ناکامی کے اسباب:

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت عموماً کیوں ناکام ہوتی ہے؟ اس کی درج ذیل وجوہ ہیں:

(۱) تعلیم وتربیت بہت ہی صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ہے یہ کام جتنی توجہ، دلسوزی اور جدوجہد چاہتا ہے، اس کے لئے عملاً کم ہی لوگ آمادہ ہوتے ہیں۔

(۲) عام طور پر بچوں کی عمر اور صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ان سے توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں اور جب ان سے بار بار کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوتی ہیں اور رفتار ترقی بھی خلاف توقع بہت سست دکھائی دیتی ہے تو اصلاح حال کی طرف سے بددل ہو کر لوگ عموماً نہ صرف اپنی کوششوں میں کمی کر دیتے ہیں بلکہ اپنے رویے اور برتاؤ سے خود بچوں کو بھی مایوسی اور بددلی کا شکار بنا دیتے ہیں اور ان میں خود اعتمادی باقی نہیں رہ جاتی۔

(۳) پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہے، بڑوں کے غلط نمونے اور ہم عمروں کی بری صحبت کے غیر محسوس اثرات بچے برابر قبول کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اچھے بھلے والدین کے بچوں میں بھی غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر طرح طرح کی خرابیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔

(۴) جس بچے کا بھی جائزہ لیجئے یہی معلوم ہوگا کہ چند اگر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں تو متعدد اسے بگاڑنے کے درپے رہتے ہیں۔

(۵) ضروریات زندگی اب محدود نہیں رہیں بلکہ ان کی فہرست بہت طویل ہوگئی ہے ،اقتصادی نظام اور معاشی ڈھانچہ بھی روز بروز پر پیچ ہوتا جا رہا ہے، چناں چہ ضروریات کی تکمیل کے لئے دوڑ دھوپ سے فرصت نہیں ملتی، بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دینے کی توفیق کہاں سے نصیب ہو۔

(۶) مناسب تعلیم وتربیت کے لئے جس صلاحیت اور سلیقہ کی ضرورت ہے اکثر لوگ اس سے بے بہرہ ہوتے ہیں چناں چہ ان کی کوششیں بارآور ہونے کے بجائے بسا اوقات الٹی پڑتی ہیں۔

(۷) والدین کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری، جدائی، موت، عدم موجودگی یا گھر

سے دوری وغیرہ بھی بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت میں بہت زیادہ مزاحم ہوتی ہیں۔

(۸) باطل نظام نے زندگی کی قدریں بدل دی ہیں، مادہ پرستی ذہنوں پر اس قدر غالب آ گئی ہے کہ بچوں کی دنیا سنوارنے اور ان کا مستقبل شاندار بنانے کے لئے اچھے بھلے لوگ اپنے جگر گوشوں کے ایمان واخلاق کو اپنے ہاتھوں شیطان کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

(۹) کتنے لوگ اپنی معاشی پریشانیوں، علالتوں یا دیگر معذوریوں ومجبوریوں کے باعث اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت خود کر نہیں پاتے اور کسی حلقے سے انہیں اس ضمن میں کوئی امداد بھی نہیں مل پاتی، کیوں کہ صنعتی انقلاب نے خاندانی نظام درہم برہم کر دیا ہے، سماجی بندھن بھی ڈھیلے پڑ چکے ہیں، چناں چہ والدین کی معذوری، کوتاہی اور غفلت کی صورت میں خاندان کے دوسرے افراد اس بار کو برداشت کرنے کے لئے نہ تو خود آمادہ ہوتے ہیں نہ سماج اپنے کو مجبور پاتا ہے اور نہ خود سماج ان بچوں کا کوئی معقول انتظام کرتا ہے۔

(۱۰) بچوں کو مصروف رکھنے اور ان کے فرصت کے اوقات کو کار آمد بنانے کے لئے دلچسپ تعمیری مشاغل یا موزوں کھیلوں وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو پاتا، چناں چہ بچوں کی صلاحیتیں غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں، وہ آوارہ گردی کا شکار ہو جاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکات کرنے لگتے ہیں۔

(۱۱) سماج میں بڑھتی ہوئی فحاشی، بے حیائی، اخلاقی بے قیدی، نظروں کو خیرہ کرنے والے پرفریب مناظر، فحش لٹریچر، عریاں تصاویر، گھناونے پوسٹرس کی فراوانی، مخرب اخلاق فلموں، افسانوں اور ناولوں کی کثرت وغیرہ عموماً اصلاحی کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہیں،

(۱۲) بچوں کی شخصیت پر گھر، مدرسہ، ماحول، معاشرہ، اور مملکت ہر ایک کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے مناسب اور معیاری تعلیم وتربیت کے لئے ان سب میں تعاون اور ہم آہنگی ضروری ہے، لیکن یہاں یہ چیز مفقود ہے، ہم آہنگی تو الگ رہی ان میں سے تقریباً ہر ایک کی کوششوں کا رخ الگ الگ سمتوں میں ہے، گھر کے لوگ فکر کرتے ہیں تو اچھے مدرسے نہیں ملتے، مدرسہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے تو اوروں کا تعاون حاصل نہیں کر پاتا، چناں چہ بیشتر بچے اس تناؤ اور کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تعلیم کا مفہوم

بچوں کی تعلیم ایک ایسا موضوع ہے جس سے کم وبیش ہر ایک کو دلچسپی ہوتی ہے، کسی مجلس میں اس مسئلہ کو چھیڑ کر دیکھ لیجئے، مرد، عورت، امیر غریب، شہری دیہاتی، مسلم غیر مسلم، غرض ہر فرقے وطبقے کے لوگ متوجہ ہو جائیں گے اور موقع ملا تو ہر ایک اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ تبصرہ بھی کر دے گا۔

یہ عمومی دلچسپی کچھ فطری بھی ہے کیوں کہ:

(۱) اللہ کے فضل سے سب بال بچے والے ہوتے ہیں اور سب کو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر بھی ہوتی ہے۔

(۲) ہر ایک اپنی اولاد کو اپنے سے بڑھ چڑھ کر دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے تعلیم وتربیت کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔

(۳) ہر ایک کی بعض آرزوئیں اور تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جو اس کے اپنے ہاتھوں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں وہ اپنی اولاد کے ذریعہ ان کی تکمیل چاہتا ہے، چناں چہ اس کے لئے وہ مناسب تدابیر کرانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

(۴) اپنے آدرشوں کے مطابق اپنی اولاد کو پروان چڑھتا نہیں دیکھتا تو ہر ایک کڑھتا ہے اور بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔

(۵) مستقبل کی تیاری کے لئے قدرت نے بچپن کی جو طویل مدت عطا فرمائی ہے ہر ایک اسے کار آمد بنانا چاہتا ہے۔

لیکن اس مسئلہ پر لوگوں کے تبصرہ کا تجزیہ کیجئے، جتنے منھ اتنی باتیں ہونگی ایسا محسوس ہوگا کہ ہر ایک کے ذہن میں تعلیم کا ایک الگ مفہوم ہے اور ایک جداگانہ تصور، بمشکل چند افراد ایسے ملیں گے جو کسی ایک مفہوم یا ایک تصور پر متفق ہوں، یہاں تک کہ ماہرین تعلیم کے مابین بھی اس ضمن میں شدید اختلاف پائے جاتے ہیں۔

اس انتشار فکری کے بھی دراصل متعدد وجوہ ہیں:

(۱)نظریہ حیات کا اختلاف(۲)آدرشوں کا اختلاف(۳) ماحول کا اختلاف (۴)حالات وضروریات میں اختلاف (۵)شخصیت کی پیچیدگی (۶)تعلیمی اسکیموں میں اختلاف(۷)طریق تعلیم کا اختلاف۔

تعلیم کے معنی:

تعلیم کے لغوی معنی کسی کو کچھ بتانا، پڑھانا یا سکھانا، بعض لوگ غلط فہمی میں اس کو تدریس کا ہم معنی سمجھتے ہیں، بعض طلبہ کو بعض مضامین یا کتب کا درس دے دینا یا انہیں لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ سکھا دینا، حالاں کہ یہ بہت جامع لفظ ہے، اس کے مفہوم میں تدریس کے ساتھ ساتھ (فنون میں مہارت پیدا کرانا) تادیب (ادب سکھانا) اور تربیت (شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ نشوونما کرنا) بھی شامل ہے۔

تعلیم کا محدود اور وسیع مفہوم:

تعلیم کا لفظ آتے ہی ذہن عموماً ان منظم کوششوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو طلبہ کے لئے تعلیمی ادارے انجام دیتے ہیں بلاشبہ باضابطہ اور رسمی (Formal) تعلیم یہی ہے اور اس کے اثرات بھی بہت دور رس ہوتے ہیں مگر یہ تعلیم کا بہت محدود مفہوم ہے کیوں کہ تعلیمی اداروں میں تو بچے بہت کم وقت گذارتے ہیں اور بہت ہی محدود معلومات وتجربات حاصل کرتے ہیں جب کہ ان کے جاننے، سیکھنے اور تجربات حاصل کرنے کا عمل پیدائش سے لیکر موت تک برابر جاری رہتا ہے، تعلیمی اداروں کی باضابطہ تعلیم کے علاوہ نہ جانے کتنی باتیں وہ اپنے گھر، محلے پڑوس، فطری وسماجی ماحول اور اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی دنیا اور اس میں بسنے والے افراد سے سیکھتے ہیں، اگر چہ یہ تعلیم غیر رسمی اور بے ضابطہ ہوتی ہے لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے باضابطہ تعلیم سے کم نہیں ہے، اس طرح تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات وتجربات شامل شمار ہوتے ہیں جو گود سے گور تک ہر فرد باضابطہ یا بے ضابطہ خود حاصل کرتا ہے یا اسے حاصل کرائے جاتے ہیں۔

تعلیم وتربیت پر اثر انداز عوامل:

تعلیم کے اس وسیع مفہوم سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت پر متعدد عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ان میں خاص خاص یہ ہیں:

(۱) گھر (۲) مدرسہ (۳) ماحول (۴) معاشرہ (۵) مملکت یا حکومت

گھر:

تعلیم وتربیت کا اولین اور اہم ترین ادارہ گھر ہے پیدائش سے لیکر چار پانچ سال کی عمر تک بچے کی ساری چلت پھرت گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی ہے گھر کے افراد اور گھریلو ماحول کا جو اثر بچہ قبول کرتا ہے وہ بہت ہی دوررس اور انتہائی اہم ہوتا ہے۔یہیں وہ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا غرض سب کچھ سیکھتا ہے، یہیں اسے وہ حقیقی محبت وشفقت، ہمدردی وتعاون اور آسائش وناز برداری نصیب ہوتی ہے جو اس کی تربیت وپرورش کے لیے نہایت ضروری ہے، ماں باپ، بہن بھائی، دادا دادی، اور دوسرے اعزہ واقارب مختلف حیثیتوں سے اس کے معلم کا کام انجام دیتے ہیں، ان کے عادات واطوار، حرکات وسکنات کی تقلید کرکے بچہ اپنے کو مختلف اوصاف سے متصف کرتا ہے، بچوں کے سادہ ذہن ودماغ پر گھریلو زندگی کے جو گہرے نقوش ثبت ہوجاتے ہیں وہ زندگی بھر نہیں مٹتے، مدرسے میں داخل ہونے کے بعد بھی گھر کی اہمیت کم نہیں ہوتی، کیوں کہ مدرسہ میں بچے صرف چند گھنٹے رہتے ہیں، اسی مختصر وقت میں انہیں لکھانا پڑھانا، ان کی جسمانی عملی اور اخلاقی تربیت کرنا، ان کے عادات واطوار پر نظر رکھنا، یہ سب کام گھر کے تعاون کے بغیر تنہا مدرسہ کسی طرح بھی انجام نہیں دے سکتا، گھر کو بہرحال مندرجہ ذیل فرائض انجام دینے ہی پڑیں گے ۔

گھر: بچوں کا قاتل یا مسیحا:

گھر بچوں کا قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی، اچھے تعلیمی عمل کے لئے اگر ہم کم سے کم لوازمات جوڑنا چاہیں تو اس کے لئے کسی لمبی چوڑی تقریر یا کسی مشکل فلسفے کی ضرورت نہیں

پیش آئے گی بلکہ صرف دو چیزوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

(۱) ماحول (۲) توجہ

سردست ہم ماحول کا جائزہ لیں گے۔

تالاب میں کنول : یہاں ماحول سے مراد تعلیمی ماحول ہے جب اسکول اور کالجوں کا رواج نہیں تھا اس زمانے میں اکثر ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوا کرتی تھی، مولانا محمد اسمعیل میرٹھیؒ سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد تک اور محمد حسین آزاد سے لیکر تو خواجہ الطاف حسین حالی تک آپ کو گھر پر ہی پڑھتے ہوئے ملیں گے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ گھر بڑی حد تک تعلیمی ضرورت پوری کرسکتا ہے، اس جملے کو ذرا بدل کر اور مزید ذمہ دارانہ طور پر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گھر ہی بڑی حد تک تعلیمی ضرورت پوری کرسکتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچہ گھر کے تالاب میں ہیں ایک چنچل مچھلی نہیں بلکہ خوبصورت کنول ہے۔

نغمے بیتاب ہیں : اگر ہم تعلیمی ضروریات کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اسے بھی کم از کم دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا:

(۱) تعلیمی عمل (۲) تعلیمی وسائل

یونیفارم، کتابیں، کاپیاں، عمارت، تختہ سیاہ، انتظامیہ، نقشہ، سائنسی آلات اور لائبریری وغیرہ وغیرہ یہ سب تعلیمی وسائل ہیں اور اتفاق سے سب کے سب جامد ہیں، اگر انہیں استعمال میں نہ لایا جائے تو یہ بجائے خود کوئی تدریسی عمل انجام نہیں دے سکتے، گویا یہ سب نقارے اور چوب ہیں، ستار اور اس کے تار ہیں، کوئی نقارے پر چوب مارے اور ستار کے تاروں کو چھیڑے تو دیکھیے موسیقی کیسے جھنجھنا اٹھتی ہے،، اس کے برعکس تعلیمی عمل ایک غیر جامد اور غیر معروضی کیفیت اور عمل کا نام ہے جو وسائل کی منڈیر پر بیٹھ کر ذہن کے کنویں میں جھانکتا ہے، تاکتا ہے، اترتا ہے، پیرتا ہے، اور ذہن کو ذہن رسا اور فکر کو پرواز بخشتا ہے اس کی ابتداء ﴿مالم یعلم﴾ (نہیں معلوم) سے ہوتی ہے اور انتہاء ﴿علم بالقلم﴾ (قلم کے ذریعہ لکھنا سکھادیا) پر ہے یعنی تعلیمی وسائل اور تعلیمی عمل ایک سکے کے دو رخ ہیں لیکن تعلیمی عمل کی اہمیت بہرحال زیادہ ہے،

بستے میں گھر : گھر اس تعلیمی عمل کا سب سے اہم رکن ہے، گھر انسانی زندگی

میں آنے والی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے، بچہ ہوتا کہیں ہے لیکن اس کا گھر اس کے ساتھ ضرور رہتا ہے، بچہ مدرسہ جاتے وقت اپنے گھر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے، وہ چھٹی ہونے تک اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھتا ہے اور گھنٹی بجتے ہی اپنے آپ کو گھر کے حوالے کردیتا ہے، البتہ اس کی خواہش رہتی ہے کہ اسکول کسی صورت میں اس کے ساتھ اس کے گھر نہ جانے پائے، کیوں کہ تعلیم ایک غیر مسرت بخش عمل ہے، جبکہ گھر ایک مسرت زا تجربے کا نام ہے، اس لئے بعض تعلیمی مفکرین نے سوچا کہ گھر کو مدرسہ بنادیا جائے اور مدرسہ کو گھر، لیکن ہمارے نزدیک یہ ایک بے ترتیب بلکہ بدترتیب عمل کا نام ہوگا، بہتر یہ ہے کہ اگر گھر کو مدرسہ نہیں بناسکتے تو کم از کم گھر کو گھر رہنے دیا جائے، یہی زیادہ اچھا ہے، بہتر ہے اپنے گھر کو روزانہ اپنے بستے میں لپیٹ کر مدرسہ لے جایا کرے۔

ہر صبح نیا طور: بچہ اس دنیا میں نووارد ہے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئی دنیا کو دیکھنا چاہتا ہے، اس کا ذہن یہ فلاں ہے! سے زیادہ یہ کیا ہے؟ پر یقین رکھتا ہے اسے ہر وقت تبدیلی چاہیے، تعلیم متنوع لیکن ایک مربوط عمل کا نام ہے، اس لئے مدرسہ میں یکسانیت کا پایا جانا لازمی ہے، ذہین بچے تو اس ماحول سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں، جو اکتاتے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا گھریلو ماحول مدرسہ سے پست ہے، پھر پڑھا کو بچے بھی نہیں اکتاتے، ضروری نہیں کہ پڑھا کو بچے ذہین بھی ہوں، یہی وجہ ہے کہ ایک اوسط بچے کے منقلب ذہن کو مدرسے کی بہ نسبت گھر زیادہ بھاتا ہے کیوں کہ گھر کا ماحول ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے وہ کبھی ایک رجحان پر قائم نہیں رہتا۔

فرائض :

(۱) پرورش، جسمانی تربیت اور صحت وصفائی کی دیکھ بال، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا مناسب بندوبست کرنا، جسم اور لباس کی صفائی، پابندی سے نہانے دھونے، کپڑے بدلنے، ناخن اور بال تراشوانے وغیرہ کا اہتمام کرنا، کھیل کود یا ورزش اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کرانا وغیرہ۔

(۲) بچے کے عادات واطوار پر نظر رکھنا، شفقت ومحبت سے ان کی تربیت کرنا اور رفتہ

رفتہ پسندیدہ عادات ومعمولات کا پابند بنانا۔

(۳) گھریلو زندگی کو پاکیزہ بنانے اور افرادِ خاندان کے باہمی تعلقات کو استوار رکھنے کی کوشش کرنا تاکہ بچہ شعوری یا غیر شعوری تقلید کے لیے اچھے نمونے پا سکے۔

(۴) تعلیم وتربیت کے ضمن میں مدرسے کی طرف سے دی ہوئی ہدایات کی پابندی کرانا۔

یہ ہیں وہ بنیادی فرائض جو صحیح طور پر گھر ہی انجام دے سکتا ہے اور اسی کو دینا بھی چاہیے، لیکن جہالت، افلاس، وسائل وذرائع کی کمی، والدین کی مصروفیت اور عمومی بگاڑ کے باعث بہت کم گھر اپنے ان فرائض کو کماحقہ انجام دیتے یا دے سکتے ہیں، صنعتی انقلاب نے گھریلو نظام کو اور زیادہ درہم برہم کر دیا ہے، باپ کہیں رہتا ہے، بچے کہیں، بھلا ان کی دیکھ بھال کون کرے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسے عموماً گھروں کے تعاون سے محروم رہتے ہیں، گھریلو نظام کو مستحکم رکھنے اور افرادِ خاندان کو بچوں سے متعلق اپنے فرائض کو انجام دینے کی طرف برابر توجہ دلاتے رہنا چاہیے ورنہ آئندہ نسلوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

مدرسہ:

بچوں کی تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہونے والا دوسرا سب سے موثر عامل مدرسہ ہے، بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھانے کی ذمہ داری اسی کے سپرد ہوتی ہے، بچے جو کچھ مدرسے کے باہر سیکھتے ہیں اس میں نہ تو کوئی نظم ہوتا ہے اور نہ ترتیب، مدرسہ ایک منظم ادارہ ہوتا ہے جو باصلاحیت اساتذہ کی مدد سے ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ بچوں کی تعلیم دیتا اور ان کی سیرت وشخصیت کو سنوارتا ہے، گھر کی طرح اپنے مدرسے سے بھی بچوں کو جذباتی لگاؤ ہوتا ہے وہ اپنے استاذ کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی سمجھتے ہیں، اس کی معلومات پر غیر معمولی اعتماد کرتے ہیں، اس کی سیرت وکردار کو اپنے لئے قابلِ تقلید اسوہ سمجھتے ہیں، مدرسے کی فضا انہیں بے حد متاثر کرتی ہے، یہاں بچے کی سیرت وشخصیت پر جو نقوش ثبت ہوتے ہیں وہ زندگی بھر قائم رہتے ہیں، انہیں وجوہ سے اس عامل کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

مدرسے کے فرائض:

(۱) بچوں کو مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنا، بچے ادھر ادھر سے جو کچھ سیکھتے یا معلومات حاصل کرتے ہیں وہ عموماً ناقص یا ناکافی ہوتی ہیں، ان میں کوئی نظم وترتیب بھی نہیں ہوتی، مدرسے کا فرض ہے کہ وہ ایک خاص تدریج سے اور نظم وترتیب کے ساتھ انہیں معلومات بہم پہنچائے اور مہارت پیدا کرائے۔

(۲) اصلاح وتربیت کرنا، علمی عملی، جسمانی یا اخلاقی حیثیت سے بچوں میں جو خرابیاں جڑ پکڑنے لگتی ہیں، ان کی اصلاح کرنا، پسندیدہ عادات واطوار کا حامل بنانا، ان کی اندرونی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر ڈالنا، نیز انہیں ان عملی واخلاقی اوصاف سے متصف کرنا جو انفرادی، اجتماعی اور عائلی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے میں معاون ہوں۔

(۳) بچوں کے اندر برے بھلے کی تمیز، حق سے محبت اور باطل سے نفرت، بھلائیوں کے پھیلانے اور برائیوں کے مٹانے کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ وہ معاشرے کے ناپسندیدہ رجحانات کا مقابلہ کر سکیں، خود اس کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔

(۴) طلبہ کے مابین ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے جو فرق ہوتا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر انفرادی توجہ دینا تاکہ ہر بچہ اپنی بساط اور صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

ماحول:

یہ تیسرا اہم عامل ہے، بچوں کی تعلیم وتربیت پر ان کے ماحول کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے جس جغرافیائی ماحول میں رہتا ہے، جس طرح کے مناظر سے دوچار ہوتا ہے، جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، جن بچوں کے ساتھ کھیلتا کودتا اور اٹھتا بیٹھتا ہے، ان سب کا مجموعی اثر قبول کرتا ہے آس پڑوس کے لوگوں کے رہن سہن، عقائد واعمال، رسم ورواج وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے ماحول اگر اچھا ہو تو مدرسے اور گھر دونوں کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں ورنہ

دونوں کو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں، بسا اوقات بھلے گھروں کے بچے اور معیاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی باوجود ہر طرح کی کوششوں کے برے ماحول کا شکار ہوجاتے ہیں اور ان کی اٹھان مطلوبہ نہج پر نہیں ہو پاتی، اس لیے ماحول کو بھی تعلیم وتربیت کے لیے سازگار بنانے کی پوری کوشش ہونی چاہیئے۔

معاشرہ:

انسان عموماً اپنے ماحول اور معاشرے ہی کی پیداوار ہوتا ہے، بہت کم افراد ایسے انقلابی ذہن کے ہوتے یا براہیمی نظر رکھتے ہیں جو اپنے گردوپیش سے بلند ہوکر کچھ سوچ اور کرسکیں۔ معاشرے میں جن چیزوں کا چلن ہوتا ہے افراد بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں کو اپنا لیتے ہیں۔

آج کی سوسائٹی میں متعدد عناصر سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور افراد پر اپنے برے بھلے نقوش ثبت کرتے رہتے ہیں، مثلاً مختلف قسم کی مذہبی، سماجی وسیاسی جمعیتیں، کلب سوسائٹیاں، پریس، پلیٹ فارم، سینما، ریڈیو، میلے ٹھیلے، دارالمطالعے وکتب خانے، عجائب گھر اور نمائش گاہیں، خدمت خلق اور رفاہ عام کے ادارے وغیرہ، افراد ساری زندگی ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتے اور ان کے اثرات قبول کرتے رہتے ہیں، معاشرے کے یہ مختلف عناصر اگر صحیح بنیادوں پر کام کرتے ہیں تو افراد کو اونچا اٹھانے اور ان کی سیرت وکردار کو سنوارنے میں بہت معاون ہوتے اور اپنے لیے بےلوث خادم تیار کرتے ہیں ورنہ ان کی وجہ سے افراد بگڑتے اور معاشرے کے ساتھ انہیں بھی لے ڈوبتے ہیں۔

معاشرے کے فرائض:

(۱) اجتماعی ضمیر کو بیدار رکھے تاکہ برے عناصر ابھر کر معاشرے کو بگاڑ نہ سکیں۔

(۲) طرح طرح کے اداروں، کلبوں اور سوسائیٹیوں وغیرہ سے اپنے آپ کو مالا مال رکھے تاکہ ہر صلاحیت اور رجحان کے افراد اپنے ذوق اور بساط کے مطابق خود بھی استفادہ کرسکیں اور سماج کو بھی فائدہ پہنچا سکیں۔

(۳) سماج کے پس ماندہ، معذور اور کچلے ہوئے افراد کو سہارا دینے اور ان کی

صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اہتمام کرے۔

حکومت یا مملکت : مملکت کا دائرہ اختیار دن بدن وسیع تر ہوتا جارہا ہے، اجتماعی امور سے آگے بڑھ کر اب وہ انفرادی زندگیوں میں بھی دخل دینے لگی ہے، اس کے وسائل وذرائع بہت وسیع ہیں، شہریوں کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثرات سے خالی نہیں، چناں چہ تعلیم وتربیت کا بھی یہ سب سے بڑا اور سب سے مؤثر عمل ہے، ایسی صورت میں اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

مملکت کے حسب ذیل فرائض ہیں:

(۱) ابتدائی تعلیم وتربیت سے ہر شہری کو آراستہ کرنا۔

(۲) بالغان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنا۔

(۳) بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دینا۔

(۴) علم وفن، طب وجراحت، صنعت وحرفت، انجینئرنگ وزراعت وغیرہ کی ترقی کے لئے چھوٹے بڑے طرح طرح کی متعدد ادارے قائم کرنا۔

(۵) اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے چلانے کی سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۶) پرائیوٹ اداروں کو حتی الامکان آزادی سے کام کرنے کے مواقع دینا۔

(۷) شہریوں کی تعلیم وتربیت پر غیر معمولی توجہ دینا اور ملکی بجٹ میں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنا۔

(۸) نادار طلبہ کی تعلیم کے لیے وظائف ومراعات کا بندوبست کرنا۔

(۹) گونگے، بہرے، اندھے، اور ذہنی یا جسمانی حیثیت سے معذور بچوں کے لیے ان کے مناسب حال تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا۔

(۱۰) وسیع پیمانے پر اچھے کردار کے صاحب صلاحیت اساتذہ تیار کرنا۔

یہ ہیں تعلیم وتربیت کے مختلف عوامل، ان عوامل ہی کی اچھائی برائی، فرض شناسی، لاپروائی پر تعلیم وتربیت کے اچھے برے نتائج کا انحصار ہے لیکن جہاں تک خود ان عوامل

کے برے یا بھلے ہونے کا تعلق ہے تو اس کا دارومدار ان اساسی تصورات ومعتقدات پر ہے ان اداروں کو اچھا اور فرض شناس بنانے کی جدوجہد ہونی چاہیے اور یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کی پشت پر کام کرنے والے تصورات ومعتقدات کی اصلاح کی جائے۔

جدید تعلیمی رجحانات:

الکلمۃالحکمۃضالۃ الحکیم فحیث وجدھا فھو أحق بھا

حکمت ودانائی کی بات ایک صاحب حکمت اور دانا شخص کی گم شدہ چیز ہے پس جہاں اسے وہ پائے اس کا وہی زیادہ حق دار ہے (اسے لے لینا چاہیے) (ترمذی ،ابن ماجه)

دنیا کے مختلف ممالک میں آج جن تعلیمی نظریات کا عام طور پر چلن ہے اور جو نظام ہائے تعلیم وہاں مسلط ہیں وہ اپنی بعض بنیادی خرابیوں کے باعث اگرچہ انتہائی قابل اصلاح ہیں لیکن طویل تجربات ومشاہدات اور بچوں کی نفسیات کے مطالعے کی روشنی میں چند ایسے رجحانات ابھر کر سامنے آرہے ہیں جو مفید ہیں اور اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے بھی نہیں اسی لیے خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر انہیں اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے ،مثلاً:

(۱) تعلیم کے مقصد ومفہوم کو، لکھنے پڑھنے تک محدود رکھنے یا چند کتب ،مضامین اور فنون میں طلبہ کو مہارت پیدا کر دینے کے بجائے اس میں مزید وسعت دی جائے۔

(۲) تعلیم کے ذریعہ طلبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں (ذہنی وجسمانی ،عملی واخلاقی جذباتی وروحانی) کی ہم آہنگ نشوونما اور متوازن ارتقا۔

(۳) انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں سے طلبہ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں کماحقہ انجام دینے اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت۔

(۴) خود اعتمادی کا جذبہ، صورتحال سے نمٹنے کی صلاحیت اور روزمرہ کے کاموں کو بلا جھجک انجام دینے پر قدرت۔

(۵) فرصت کے اوقات کو مفید مشاغل میں استعمال کرنے کی عادت۔

(۶) طلبہ اور اساتذہ دونوں میں تحقیقی اسپرٹ اور مزید معلومات حاصل کرنے کی

تڑپ

(۷) نصاب ،مضامین یا درسی کتب کے بجائے بچہ کو مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت دی جائے ،یعنی: یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ تعلیم بچے کے لیے ہیں نہ کہ بچہ تعلیم کے لیے ،تاکہ ساری تعلیمی کوششیں بچے کو مختلف حیثیتوں سے فائدہ پہنچانے کے لیے ہوں نہ کہ بچے کو تعلیم پر قربان کرنے کے لیے۔

(۸) ہر مضمون سے متعلق ضروری تصاویر، چارٹس اور دیگر توضیحی وتعلیمی سامان استعمال کیے جائیں تاکہ اسباق دلچسپ ہوجائیں ،تصورات واضح بنیں اور ایک سے زائد حواس کو استعمال کرکے زیادہ مستحکم معلومات حاصل کرنے کا موقع ملے۔

(۹) طلبہ کے مابین انفرادی فرق اور ان کے مخصوص میلانات اور رجحانات پیش نظر رہیں پوری جماعت کے بجائے ہر بچے کو علیٰحدہ اکائی تسلیم کیا جائے اس کی انفرادیت کا لحاظ اور اس کی شخصیت کا احترام کیا جائے نیز پوری جماعت کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے۔

(۱۰) استاذ اپنے کو مستبد حکمراں کے بجائے بچوں کے مشیر، معاون، اور محافظ کی حیثیت میں پیش کرے۔

(۱۱) مستقبل کی تیاری کی فکر میں بچوں کی موجودہ دلچسپی کو یکسر نظرانداز نہ کر دیا جائے ،ورنہ اس کا ردعمل شدید ہوگا اور وہ مقصد ہرگز حاصل نہ ہوگا جس کے لیے اسے حال کی مسرتوں سے محروم کیا جارہا ہے بلکہ شخصیت کے بعض پہلو مجروح ہوں گے، اور متوازن ارتقاء ہرگز نہ ہوسکے گا۔

(۱۲) سبق کو آگے بڑھانے میں طلبہ کا تعاون حاصل کیا جائے، درجے کو ساری معلومات خود فراہم کر دینے کے بجائے ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ بچے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

تعلیم کا مقصد:

تعلیم کے مفہوم کی طرح تعلیم کے مدعاء میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے ،والدین اپنے بچوں کو عموماً اسی لیے تعلیم دلاتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کمانے کھانے کے قابل

ہوجائیں :تعلیم برائے معاش ؛ ہی ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے اگر چہ زبان سے اس کا اعتراف کم ہی لوگ کرتے ہیں، بلاشبہ کمانا کھانا انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور بہر حال اس بات کی کماحقہ فکر ہونی چاہیے کہ بچہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے لیکن انسانیت کا تقاضہ صرف یہی تو نہیں ہے تنہا اسی کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دینے سے بچہ معاشی حیوان تو ضرور بن جائے گا ،انسان ہرگز نہیں بن سکتا ،اور مسلمان کے نزدیک تو جان سے زیادہ ایمان عزیز ہوتا ہے، ایسی صورت میں معاش ہی کو مقصود زندگی ٹھہرا کر تعلیم وتربیت کے نظام کو اس کے گرد گھمانا دراصل بچے پر احسان نہیں صریح ظلم ہے۔

اسی طرح بیشتر اساتذہ بھی تعلیم کا مقصد زبان سے خواہ کچھ بھی بیان کریں مگر عملاً ؛ تعلیم برائے علمیت ؛ ہی کے قائل نظر آتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنی ساری توجہ لکھنے پڑھنے ،اپنی لیاقت بڑھانے اور اچھے نمبروں سے پاس کرنے پر مرکوز رکھیں ،شخصیت کے دیگر پہلو (جسمانی ،عملی ،اخلاقی وغیرہ) ان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں ،حالانکہ متوازن اور کامیاب زندگی کے لئے یہ پہلو بھی اتنا ہی نہیں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ توجہ کے محتاج ہوتے ہیں، علمی لیاقت میں اضافہ بلاشبہ نہایت ضروری بھی ہے اور غیر معمولی توجہ بھی چاہتا ہے، لیکن شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز یا علمیت پر قربان کر دینے کے نتائج بھی بہت خطرناک ہوتے ہیں، ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور اعلی علمی لیاقت رکھنے والے لوگ صحت ،اخلاق یا عمل کے اعتبار سے ناقص رہ کر اور دوسروں کے لیے مفید ہونے کے بجائے انتہائی نکمے اور مضر ثابت ہوتے ہیں

تعلیم کے متعدد اور مقاصد بھی پیش کئے جاتے ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں

(۱) سماج کا بے نفس خادم بنانا۔

(۲) مملکت کا اچھا شہری بنانا۔

(۳) شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ سنوارنا۔

(۴) انفرادیت کی نشوونما اور خودی کی تکمیل کرنا۔

(۵) زندگی بسر کرنے کے لیے پورے طور سے تیار کرنا یعنی طلبہ کو اس لائق بنانا کہ وہ: اپنی ذات کا تحفظ کر سکیں ۔ عام ضروریات زندگی فراہم کر سکیں ۔ اولاد اور کنبے کی پرورش

وگہداشت کر سکیں ۔ سماجی تعلقات کو استوار رکھ سکیں ۔ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح گزار سکیں۔

(۶) اخلاق اور سیرت وکردار کو سنوارنا۔

(۷) صحت مند جسم میں صحت مند دل ودماغ پروان چڑھانا وغیرہ۔

تعلیم کے مذکورہ مقاصد کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان میں سے ایک بھی تنہا مقصد نہیں بن سکتا کیوں کہ ہر ایک الگ الگ ناقص یک رخایا مبہم ہے۔

تعلیم کا صحیح مقصد

اللہ کا صالح بندہ بنانا ہے۔

یعنی طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی ،جسمانی ،عقلی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں، کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں نیز انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق ومالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کماحقہ عہدہ برآ ہو سکیں، تعلیم کا یہی صحیح اور بنیادی مقصد ہے۔

ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تعلیم وتربیت میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رہیں:

(۱) جسمانی صحت: اللہ تعالی نے جو سڈول جسم عطا فرمایا ہے اس کی صحت ونشوونما کے لیے ضروری معلومات بہم پہونچانا۔

حفظان صحت کے اصولوں کے پابندی کرانا؛ جسمانی محنت، ورزش یا کھیل اور صفائی ستھرائی کا عادی بنانا اور احتیاطی تدابیر بتانا۔

(۲) فطری قوتوں اور صلاحیتوں کی نشوونما: اللہ تعالی نے انسان کے اندر جو فطری قوتیں وصلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں وہ سب اس کے لیے نہایت ضروری اور کارآمد ہیں ان سب کو پروان چڑھانے کی فکر کرنا ان کے مناسب استعمال کے ضمن میں مدد اور رہنمائی کرنا ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ تو دبانا اور کچلنا اور نہ ان کو نظر انداز کرنا۔

(۳) فطری خواہش ومیلانات کوصحیح رخ پرڈالنااور پسندیدہ نیز مفید مشاغل میں دلچسپی پیدا کرنا،اسلامیات،زبان وادب،معاشراتی علوم اور بیرون نصاب مصروفیات وغیرہ کے ذریعے یہ کام کیا جائے کہ وہ اپنی اپنے فرصت کے اوقات پسندیدہ اور مفید مشاغل میں صرف کرنے کے عادی بنیں۔

(۴) صحیح انداز سے سوچنے اور برے بھلے حق وباطل میں تمیز کرنے کی کسوٹی فراہم کرنا تاکہ غلط افکاراور باطل نظریات کا شکار نہ ہو۔

(۵) انفرادی،عائلی اوراجتماعی ذمہ داریوں کا صحیح علم اور انہیں انجام دینے کی عملی تربیت کرنا۔

(۶) قدرت کے کارخانہ کا علم بہم پہنچانا اوراس کے پوشیدہ اور کھلے ہوئے خزانے کا صحیح مصرف بتانا۔

(۷) لکھنا پڑھنااوردیگر معلومات فراہم کرنا۔

(۸) ٹھوس سیرت وکردار کا حامل بنانا۔

اپنے زمانہ کے علم کے شہسواروں کی رائیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں

(۱) تعلیم کا مقصد پرخلوص نیکی کے ذریعے شادمانی کا حصول ہے،(ارسطو)

(۲) تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تکمیل ہے۔(پین)

(۳) تعلیم سے مراد مکمل انسان کی تربیت۔(کامینیس)

(۴) تعلیم سے مراد شعوری یاارادی ارتقاء۔(ڈیوڈسن)

(۵) تعلیم ایک ہنر ہے جس سے ماہران خصوصی نہیں انسان بنائے جاتے ہیں۔
(مانٹین)

(۶) سنگ مرمر کے ٹکڑے کے لیے جس طرح سنگ تراشی ہے ویسے ہی انسانی روح کے لیے تعلیم ہے۔(ایڈیسن)

(۷) تعلیم کا مقصد علم سے بھر دینا نہیں ہے بلکہ قوت کی تربیت کرنا ہے۔(آرکٹ)

(۸) تعلیم کا مقصد کھری، پرخلوص، بےعیب اور پاک زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔(فروبل)

(۹) تعلیم سے مراد تجربہ کی ازسرنو تشکیل ہے جس میں فرد کو اپنی قوتوں پر زیادہ تسلط پانے کے قابل بناتے ہوئے اس کے تجربے میں وسعت پیدا کی جاتی ہے اوراسے سماجی لحاظ سے زیادہ مفید بنایا جاتا ہے۔(ڈیوڈی)

(۱۰) عام طور پر انسانیت کا اعلیٰ ترین مقصد اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے اور بنابریں تعلیم کا بھی۔(ہربارٹ)

طریقہ تعلیم

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ مسئلہ دینیات کی کتابوں سے بھی زیادہ اہم اورضروری اور قابل توجہ ہے کیوں کہ اس کا تعلق زیادہ تر استاذ کی صلاحیت اور بچوں کی نفسیات اوران کی موزونیت طبع سے ہے جو عموماً مختلف ہوتی ہے اور عمر ماحول،معاشرت اور سماج کے تفاوت سے ان میں زمین آسمان کا فرق ہوتا رہتا ہے،اس سلسلہ میں سب سے بڑی اور بنیادی بات تو استاذ کی لگن ہے یعنی اگر معلم صاحب اس جذبہ سے سرشار ہوں کہ جو بچہ ان کے یہاں آئے وہ محروم نہ جائے تو لامحالہ وہ کوشش کریں گے کہ بچہ کو سمجھ کر ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے کامیابی ممکن ہو اور بچہ فیضیاب ہو سکے وہ طریقہ کہیں نرم ہوگا کہیں گرم،اس بنیادی بات کے باوجود کچھ اصول ایسے ہیں جو یکسانیت کے ساتھ سب جگہ کامیاب ہوتے ہیں اورانہیں کے پیش نظر ٹریننگ اسکولوں اوراساتذوں کے مدرسہ میں اساتذہ کو طریقہ تعلیم کی ٹریننگ دی جاتی ہے یہی اصول جو بنیادی طور پر ہر جگہ کامیاب ہیں اور ایسے ضروری ہیں کہ جب تک معلم ان کا لحاظ نہ رکھے وہ کامیاب نہیں ہوسکتا ان صفحات میں پیش کئے جارہے ہیں،اور جب کہ موجودہ دور کا تقاضہ ہے کہ ہر ایک ہمدرد ملت ذاتی طور پر دینی تعلیم کے مسئلہ سے دلچسپی لے تو یہ بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ اس کی نظر ان اصول پر بھی ہوتا کہ اس کی دلچسپی عملی طور پر زیادہ سے زیادہ کارآمد اور امت کے لئے زیادہ زیادہ مفید ہوسکے۔

بنیادی اصول

(۱) بچوں کو مانوس کیجئے:

سب سے پہلا اصول جو کسی وقت بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے یہ ہے کہ جیسے ہی بچہ آپ کے یہاں داخل ہو سبق شروع کرانے سے پہلے آپ اس کو اپنے سے مانوس کرلیں چھ سال کا بچہ جو اپنی سوجھی سمجھی بات پوری طرح زبان سے ادا نہیں کرسکتا جیسے ہی کسی اجنبی کے سامنے پہونچتا ہے مرعوب ہوجاتا ہے بسا اوقات اجنبی صورت سے اس کا ننھا سا دل لرزنے لگتا ہے شرم وحیا بہت اچھی صفات ہیں مگر بچہ جتنا زیادہ شرمیلا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اجنبی شخص کو دیکھ کر گھبرائے گا اور مرعوب ہوجائے گا، ایک گھبرایا ہوا بچہ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے نہ یاد رکھ سکتا ہے ایسی صورت میں یاد کرنے کی فرمائش سے اس کو اور زیادہ وحشت ہوتی ہے اب اگر کسی قسم کی تنبیہ بھی کردی جائے تو اس وحشت کے ساتھ استاذ مدرسہ اور تعلیم وغیرہ سب سے نفرت ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ بچہ کے لئے تباہ کن ہوتا ہے کیوں کہ وہ اسکول یا مکتب جانے سے جان چرانے لگتا ہے اور اگر ماں باپ کی طرف سے بہت کافی دباؤ نہ ہو تو بچہ پڑھنا بھی چھوڑ دیتا ہے اور دائمی جہالت اپنے لئے مقدر کرلیتا ہے پس معلم خیر اور مشفق استاذ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچہ کو اپنے سے مانوس کرلے اس کے دماغ کو مطمئن کرے اور اس کی طبیعت کو اپنی طرف مائل کرے اور عام طور پر بچہ کے دل میں جو مدرسہ یا مکتب کا ڈر بٹھا دیا جاتا ہے اس کو دل سے نکالے، ایک سمجھدار اور مشفق استاذ جس کو یہ لگن ہو کہ اس کے یہاں داخل ہونے والے بچے محروم نہ رہ جائیں بچہ کے مزاج اور اس کی طبیعت کا اندازہ کرنے کے بعد اس کو مانوس کرلینے کی مناسب تجویز کرسکتا ہے ایسے استاذ کو کسی خاص طرز عمل کا پابند نہیں کیا جاسکتا البتہ ایک عام صورت یہ ہے کہ پہلے ہی دن اس کی فکر نہ ہو کہ سبق ضرور پڑھا دیا جائے، بلکہ پہلے روز بچہ سے اس کے ماں باپ کی زبان اور انداز میں ایسی باتیں کی جائیں جن میں بچہ کا دل لگے مثلاً یہ کہے کہ تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں، تمہیں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے، تمہاری لڑائی کس سے ہوتی رہتی ہے، تمہارے

کھیل کود کے ساتھی کون کون ہیں وغیرہ وغیرہ، اسی بات چیت کے دوران میں اس کو سبق کی کچھ باتیں بھی یاد کرادی جائیں اس کام کے لئے آپ دس پندرہ منٹ بچہ کو دیجئے اور اوپر کے درجہ میں جو سمجھدار بچے ہوں ان میں سے کسی کو مامور کردیجئے کہ وہ اس نووارد بچہ سے بات چیت کرکے اس کو مانوس کریں، جب بچہ آپ سے اور مکتب کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہوجائے تب اس کو پڑھانا شروع کیجئے، بہتر ہو کہ آپ اپنے اس طرز عمل کا اعلان کردیں تاکہ بچہ کے سرپرستوں کو سبق نہ دینے کی شکایت نہ ہو، بچہ کو مانوس کرنے میں اگر ایک ہفتہ بھی صرف ہوجائے تو مضائقہ نہیں اس ہفتہ میں آپ اس کو بسم اللہ وغیرہ یاد کرادیجئے۔

(۲) درجہ کو صاف ستھرا رکھئے اور اس کو سجایئے:

ضروری بات یہ بھی ہے کہ درجہ ایسا ہو کہ بچوں کا دل لگے ماہرین طریقہ تعلیم تو یہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ اسکول یا مکتب کا مکان کھلا ہو ہوادار ہو جس میں گرمی اور سردی کی پوری رعایت ہو گھٹا ہوا بند کمرہ جہاں ہوا نہ پہنچ سکے یا ایسا کھلا ہوا کہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ نہ ہو جب بچوں کو اس میں بیٹھنا مشکل ہوگا تو وہ سبق کیا یاد کرسکیں گے، بہرحال جگہ اور مکان کا مسئلہ استاذوں کے اختیار کا نہیں اس کا تعلق مدرسہ کے منتظمین اور مدرسہ کی مالی گنجائش پر موقوف ہے البتہ استاذ صاحبان یہ کرسکتے ہیں اور یہ ضرور کرنا چاہیے کہ کمرہ صاف ستھرا رہے اس میں جگہ جگہ خوبصورت نقشے اور ایسے چارٹ آویزاں ہوں جو جاذب نظر بھی ہوں اور درجہ کے مناسب معلومات کا مرقع بھی ہوں بچے ان خوبصورت چارٹوں میں لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھنے کی کوشش کریں گے اس سے قدرتی طور پر پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔

(۳) بچے خالی بیٹھنا نہیں جانتے آپ ان کو تعلیمی کاموں میں لگاتے رہیے:

اگر آپ کا بچہ چپ چاپ بیٹھا ہو تو آپ کو فوراً فکر ہوجائے گی کہ یہ خاموش کیوں بیٹھا ہے، نہ کھیلتا ہے، نہ باتیں کرتا ہے کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے آپ فوراً پوچھیں گے کہو منا کیا بات ہے کیسی طبیعت ہے اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو، اگر بڑا شخص خاموشی

کے ساتھ سکون سے بیٹھا ہو تو نہ آپ کو فکر ہوتا ہے اور نہ آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے البتہ بچے کو خاموش بیٹھا ہوا دیکھ کر آپ فکر مند ہو جاتے ہیں، وجہ یہ ہے بچہ کی طبیعت میں امنگ ہوتی ہے بچپن کی فطرت اسے نچلا بیٹھنے نہیں دیتی بچہ کی طبیعت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ بھی چلتے رہتے ہیں اور زبان بھی چلتی رہتی ہے، بچہ خاموش اسی وقت بیٹھتا ہے جب اس کی طبیعت خراب ہو یا اس کے دل و دماغ پر کوئی غیر معمولی اثر ہو، اسکول میں آکر بھی بچہ کی اس فطرت میں فرق نہیں آتا وہ درجہ میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی حرکت برابر جاری رہتی ہے، کھیلنے کا موقع نہیں ہوتا تو باتیں کرنے لگتا ہے یا تپائی اور اور میز کے نیچے ہاتھ کر کے کھلونا بنا تا رہتا کچھ نہیں ملتا تو کاپی پر پھول یا تصویریں بناتا رہتا ہے بہر حال منشا یہ ہے کہ بچہ کی اس فطرت سے آپ بھی فائدہ اُٹھائیں کہ اس کی تمام حرکتوں اور کھیل و تفریح کی دلچسپیوں کو تعلیم کی طرف منتقل کر دیجئے، مگر صرف فرمائش کرنے ڈرانے دھمکانے یا نصیحت کرنے سے بچہ کی دلچسپیوں میں تبدیلی نہیں ہوگی آپ فرمائش کرنے کے بجائے اس کو ایسے کام بتا دیجئے جن میں وہ لگا رہے، ایسے کام آپ کو سوچ کر تجویز کرنے ہونگے اس سوچ و چار اور غور کرنے میں آپ کا کچھ وقت بھی صرف ہوگا لیکن اگر بچوں کے کامیاب استاذ بننا چاہتے تو آپ کو غور و فکر اور سوچ و چار میں کچھ وقت صرف کرنا چاہئے، عنداللہ آپ ماجور ہوں گے اور عندالناس مشکور کیونکہ قابل استادوں کی ہر شخص قدر کرتا ہے۔ تیسرے چوتھے درجہ کے بچوں کے کام زیادہ ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے تمام گھنٹے بھرے رہتے ہیں، پہلے اور دوسرے درجہ کے بچوں کا وقت زیادہ خالی ہوتا ہے ان کا کچھ وقت آپ لکھائی میں لگائیں، چھ سال کے بچہ کے ہاتھ میں قلم پکڑنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ایک بات یہ بھی ہے کہ حرفوں کے مقابلہ میں ہندسوں کا لکھنا آسان ہوتا ہے لہذا آپ حرفوں سے پہلے ہندسے لکھوائیں۔

(۴) بچوں کے شوق اور دلچسپی سے فائدہ اٹھائیے:

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ بچوں کی طبیعت کھلاڑ ہوتی ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچوں میں تحقیق و تفتیش اور کھود کرید کا شوق بھی بڑوں سے زیادہ ہوتا ہے، ایک ڈبیہ آپ

کے سامنے رکھی ہوئی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی ڈبیہ رکھی ہوئی ہے لیکن بچہ کی جیسے ہی نظر پڑے گی وہ ڈبیا کو اٹھالے گا اس کو ہلائیگا اگر اندر سے کچھ آواز آئے گی تو اس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کرے گا غرض وہ کھوج لگانا چاہے گا کہ اس ڈبیہ میں کیا ہے، ایک خوبصورت لفافہ آپ بچہ کے سامنے رکھ دیجئے وہ کبھی اس کو اپنی جگہ نہیں رہنے دیگا وہ اس کو اٹھا کر پہلے غور سے دیکھے گا پھر اس کو کھولنے کی کوشش کرے گا ممکن ہے اس کوشش میں وہ لفافہ کو بھی پھاڑ ڈالے گا غرض اس بچہ کے اندر مختلف قسم کے شوق وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں، مشفق استاذ کو ایک شکاری کی طرح رہنا چاہئے بچوں میں جس بات کا شوق دیکھے وہ اسی سے تعلیم و تربیت کا کام نکالنے کی کوشش کرے گا، بچہ اگر لفافہ اٹھا رہا ہے یا اٹھانا چاہتا ہے تو اس کو ڈانٹئے نہیں بلکہ آپ خود فرمائش کیجئے کہ وہ اس کو اٹھائے دیکھے اس پر کیا لکھا ہے، اس کی حروف کی شناخت کرائیے، پتہ پڑھوائیے پتہ لکھنے کا مقصد سمجھائیے اندر سے خط نکلوا کر خط لکھنے کا شوق پیدا کیجئے اگر اس میں قابلیت ہو تو خط لکھوائیے خط کی نقل کرائیے ڈاکخانہ کے قاعدے بتا دیجئے وغیرہ وغیرہ، ڈبیہ اگر بچہ نے اٹھائی ہے تو اس کے حروف کا تجزیہ کرائیے ڈبیہ کی ہجے کرائیے لکھوائیے یا لکھنا بتائیے اگر وہ کھول لی گئی ہے تو اس کی چیزوں سے گنتی سکھائیے وغیرہ وغیرہ، اس سلسلے میں اخلاقی تعلیم بھی دی جاتی رہے، لفافہ میں جو خط ہے وہ راز ہے لفافہ بند اس لئے کیا جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس راز سے واقف نہ ہو کسی کا خط پڑھنا عیب کی بات ہے کسی کے بھیدوں کی کرید کرنا منع ہے، یہ بتاؤ ڈبیا کی شکل کس حرف کی ہے اس قسم کے دائرہ سے کون کون سے حروف بن سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس طرح بچوں کی دلچسپیوں پر خیال رکھا گیا تو آپ ان کو مصروف بھی رکھ سکیں گے اور ان مصروفیتوں سے تعلیم کا کام بھی لیں سکیں گے البتہ اس کے لئے آپ کو ہر وقت دماغ کو خاص طور سے متوجہ رکھنا پڑے گا اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہر وقت ایک شکاری کی طرح تاک میں رہنا ہوگا مگر جو خدمت معلم اور استاذ صاحبان انجام دے رہے ہیں وہ ایسی عظیم الشان اور بنیادی خدمت ہے کہ استاذ صاحبان اس میں جس قدر بھی منہمک اور مشغول رہیں وہ نہ صرف ان کے لئے بھی سراسر خیر و برکت ہے اس کے لئے سب کچھ قربان کر دینا اجر عظیم اور فلاح دارین ہے۔

علم نفسیات

تعریف: علم نفسیات مختلف حیوانی وانسانی فطرت وعادات اور جذبات کا علم ہے۔

موضوع : اصلاح معاشرہ، تعلیم وتربیت، تجارت وکاروبار، علاج ومعالجہ، حکومت وسیادت، جنگ وجدال، وغیرہ تقریباً ہر میدان زندگی میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تعلیم وتربیت میں فوائد:

(۱) طلباء کی نفسیات کے مطالعہ سے تعلیم وتربیت میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

(۲) اس کے مطالعہ سے استاذ طلبہ میں محبوب ومقبول بنتا ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء اس کے حکم کو بصد خوشی بجالاتے ہیں۔

(۳) نفسیات سے واقف استاذ بچوں میں مدرسہ آنے اور علم سیکھنے کی رغبت پیدا کرسکتا ہے۔

(۴) علم نفسیات سے واقف استاذ خشک سے خشک مضمون کو دلچسپ بنا کر طلباء کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔

(۵) مقولہ مشہور ہے ؛جبل گردد جبلت نہ گردد ؛نفسیات کا ماہر شخص انسان کی بری جبلت کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا امالہ اچھے کام کی طرف کردیتا ہے چنانچہ نفسیات سے واقف استاذ شریر بچوں کی اصلاح اچھی طرح کرسکتا ہے۔

(۶) نفسیات کا ماہر استاذ مار پیٹ کے بغیر طلباء پر اپنا وقار قائم کرسکتا ہے۔

(۷) نفسیات کا ماہر استاذ بچوں کو نظم ونسق کا عادی بنا سکتا ہے اور ان میں تنظیمی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے۔

علم نفسیات سے ناواقفیت کے نقصانات

(۱) علم نفسیات سے ناواقف استاذ طلباء میں تعلیم حاصل کرنے کی رغبت کو ختم کردیتا ہے، جیسے سبق یاد نہ کرنے پر اتنی پٹائی کرے کہ بچے کا دل پڑھنے سے ہٹ جائے۔

(۲) علم نفسیات سے ناواقف استاذ بچوں میں مجرمانہ ذہنیت پیدا کردیتا ہے، جیسے کوئی استاذ کسی بچے کو برے القاب (غنڈا ڈاکو وغیرہ) سے پکارے تو چند دنوں بعد اس بچے میں اسی طرح کی ذہنیت پیدا ہوجاتی ہے۔

(۳) علم نفسیات سے ناواقف استاذ سے بچے پریشان رہتے ہیں، اس کی پیٹھ پیچھے غیبت کرتے ہیں۔

(۴) علم نفسیات سے ناواقف استاذ کا ادب واحترام بچے دل سے نہیں کرتے اسی لئے مکتب ومدرسہ سے نکلنے کے بعد وہ استاذ کو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے، کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے ہیں۔

(۵) علم نفسیات سے ناواقف استاذ سے بچوں میں احساس کمتری اور احساس کہتری جیسے نفسیاتی مرض پیدا ہوتے ہیں، ذہین بچہ بھی اپنے کو کند ذہن سمجھنے لگتا ہے۔

غرض علم نفسیات کو بروئے کار نہ لانے پر مزید اور بھی نقصانات ہوسکتے ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ میں علم نفسیات کا درس:

حضور ﷺ نے فرمایا؛ انما بعثت معلما؛ [ابن ماجه:۲۲۹،]

حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالی نے جہاں لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لئے نبی بنا کر بھیجا تو ایک نبی کو جس سوجھ بوجھ اور علم وحکمت کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کچھ عطا فرمایا، اسی لئے آپ ﷺ انسانوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے، آپ ﷺ کی سیرت میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جو انسانی نفسیات پر آپ ﷺ کی مہارت کی مثال ہیں یہاں ہم ان میں سے چند کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) آج تعلیمی درسگاہوں میں بچوں کو مانوس کرنے کے لئے بچوں سے کانسلنگ کی جاتی ہے، ان کی دلچسپی کی باتیں کی جاتی ہیں، جس سے بچے اور استاذ کے درمیان اجنبیت ختم ہوجاتی ہے، حضور ﷺ کی سیرت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آپ جب بچوں کے پاس سے گذرتے تو خود ہی پہلے سلام کرتے اور ان سے دلچسپی کی باتیں کرتے، ایک صحابی ابو عمیر رضی اللہ عنہ ہیں حضور ﷺ کے زمانے میں وہ بچے تھے، انہوں نے ایک پرندہ پالا تھا، حضور

ﷺ ان سے اس پرندہ کی خیریت پوچھتے تھے: نُغَیر: چھوٹے پرندہ کو کہتے ہیں، جب وہ پرندہ مرگیا تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: یا أبا عمیر! ما فعل النُّغیر؟: اے ابو عمیر! چھوٹے پرندے کا کیا ہوا؟ (یعنی مرگیا) [ابو داؤد رقم: ٤٩٦٩]

(۲) آپ ﷺ سے لوگ اتنا مانوس تھے کہ ایک نوجوان آکر حضرت رسول اللہ ﷺ سے زنا کی اجازت طلب کررہا ہے، آپ ﷺ بھی کیسے نفسیات کو پرکھنے والے اور نفسیاتی علاج کرنے والے تھے کہ نہ آپ ﷺ غصہ ہوئے نہ ڈانٹا کہ کیسا بے ہودہ سوال کرتے ہو؟ شرم نہیں آتی تم کو! بلکہ شفقت سے آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری ماں کے ساتھ کوئی زنا کرے، اس نے کہا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دوسرے بھی یہ نہیں چاہتے۔ اسی طرح اس کی خالہ، بہن اور بیٹی کی مثال دیکر اس کے لئے دعا کی، اللہ نے اس کے دل میں زنا کے فعل کی ایسی نفرت ڈالی کہ اس کے بعد اس کے نزدیک زنا سے بڑھ کر کوئی بڑا گناہ نہ تھا۔

حضور ﷺ کی معلّمانہ شان یہ تھی کہ ہر طالب دین یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

(۳) ایک سفر میں حدی خواں مستورات کے اونٹوں کو تیز لیکر چلے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان (ہودجوں) میں شیشہ کے برتن ہیں، اونٹوں کو آہستہ لیکر چلو۔ [بخاری: ٦١٦١]

(۴) كان اذا خلا بنسائه ألين الناس وأكرم الناس ضحاكا بساما [طبقات لابن سعد: ٦/٣٦٥]

جب آپ اپنی بیویوں کے ساتھ ہوتے تو بہت زیادہ نرم دل بہت خوش اخلاق خوب ہنستے اور مسکراتے۔

(۵) حضرت مقدادؓ فرماتے تھے کہ حضور ﷺ تشریف لاتے تو اس طرح سلام کرتے کہ سونے والا بیدار نہ ہوتا اور بیدار شخص سن لیتا۔ [مسلم: ٥٤٨٣]

(۶) حضرت انسؓ آپ ﷺ کے دس سال تک خادم خاص رہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کام کا حکم براہ راست نہیں فرمایا، بلکہ اس کام کی ترغیب دیتے یا اس کی خواہش کا اظہار فرماتے۔ جس کی وجہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ باوجود بچہ ہونے کے اس کام کے

کرنے کو بوجھ محسوس نہیں کرتے، جیسے عام طور پر چھوٹے بچوں کو کوئی کام حکما کہا جائے تو ان کے اندر کی ضدی طبیعت جاگ اٹھتی ہے اس کے برخلاف ترغیب دی جائے تو وہی کام فورا کر گذرتے ہیں اور اس کام میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

(۷) حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے، ایک روز مجھے کسی کام کے لیے بھیجا تو میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا اور دل میں یہ تھا کہ میں اس کام کے لیے جاؤں گا جس کا حکم آپ ﷺ نے فرمایا ہے میں نکلا اور بازار میں کھیلتے ہوئے بچوں کے پاس پہونچا تھوڑی دیر میں حضور ﷺ نے آکر میری گردن پیچھے سے پکڑ لی میں نے مڑ کر دیکھا تو حضور ﷺ ہیں اور مسکرا رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: پیارے انس! تم وہاں گئے جہاں میں نے بھیجا تھا حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ ہاں یا رسول اللہ میں ابھی جاتا ہوں۔
[مسلم: ٦١٥٥]

شاگردوں کو غلطی کا احساس ہوجائے تو اصلاح کے لئے کافی ہے، ڈانٹ پھٹکار، مارپیٹ سے کئی نقصانات ہوتے ہیں، جس کا بیان انشاء اللہ مارپیٹ کے عنوان کے تحت آئے گا۔

حدیث شریف سے علم نفسیات کے چند اصول:

آپ ﷺ نے نفسیاتی اصول بھی سکھائے ہیں جیسے:

(۱) انزلوا الناس منازلهم [ابو داؤد: ٤٨٤٢]

لوگوں کے رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے ان کا لحاظ کرو۔

فائدہ: حضور ﷺ کے پاس ایک لباس تھا جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رکھا رہتا تھا جب کوئی وفد آتا، یا کسی بادشاہ کی طرف سے ایلچی آتا تو آپ ﷺ وہ لباس زیب تن فرماتے، حضرت رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن شیمہ جب آپ ﷺ سے ملنے آئیں تو آپ ﷺ نے پرتپاک استقبال فرمایا اور اپنی چادران کے بیٹھنے کے لیے بچھادی۔

(۲) امرنا أن نتكلم على قدر عقولهم [كنز العمال: ٢٩٢٨٢]

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل کے معیار کے مطابق بات کرو۔

فائدہ: ایک دیہاتی نے آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر مسئلہ معلوم کیا، مگر دیہاتی عربی زبان میں سوال کیا: **أمن امبر امصیام فی امسفر**

کیا سفر میں روزہ رکھنا نیکی ہے، تو حضور ﷺ نے بھی اسی دیہاتی لہجہ میں جواب دیا اور فرمایا: **لیس من امبر امصیام فی امسفر** ، سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔
[مسند أحمد:٢٣٦٧٩]

حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا :؛**حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون أن یکذب اللہ ورسولہ** ؛ [بخاری:١٢٧] لوگوں سے وہی بات کرو جسے وہ سمجھ سکیں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور رسول کو جھٹلایا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:؛**ماأنت بمحدث قوما حدیثا لا تبلغہ عقولھم الا کان لبعضھم فتنۃ** ؛ [مسلم:١٤]
کسی قوم کے سامنے ایسی بات مت کرو جو وہ نہ سمجھیں ورنہ وہ بات فتنہ بن جائے گی۔

فائدہ: حضرت نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: طالب عالم کے سامنے ایسی بات نہ کی جائے جس کے وہ اہل نہ ہوں ورنہ نقصان ہوگا، استاذ کو چاہئے کہ ہر کتاب کا خلاصہ بیان کردے اور نئے مضامین پر بھی ان کو مطلع کردے بل کہ ان کو لکھوا دیا کرے تا کہ یاد کرنے میں آسانی ہو: **یسروا ولا تعسروا** آسان کرو مشکل نہ بناؤ۔ [حلیۃ الأولیاء:٩/١٤٤]

(٣) **یسّروا ولاتعسروا بشروا ولاتنفروا تطاوعوا ولاتختلفوا**
[بخاری:٣٠٣٨]
آسان کرو مشکل نہ بناؤ، خوشخبری سناؤ نفرت نہ دلاؤ، ایک دوسرے کی بات مانو آپس میں اختلاف نہ کرو۔

فائدہ: آپ ﷺ نے آپس میں کام کرنے کے تین اصول بیان فرمائے ہیں۔

(الف) کام لینے کے لئے کام کو آسان بنا کر پیش کیا جائے، استاذ طلبہ کے سامنے مشکل سے مشکل سبق اگر آسان بنا کر پیش کرے، یا طلباء سے کہے کہ سبق بہت

آسان ہے، تو طلبہ بھی اس سبق کو آسان سمجھنے لگتے ہیں، اس کے برخلاف آسان سبق اگر استاذ کہے کہ یہ سبق بہت مشکل ہے تو طلباء کے نفسیات پر اثر پڑے گا اور وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ سبق بہت مشکل ہے۔

(ب) کام لینے والا اگر انعام دینے یا کچھ کھلانے کی خوشخبری سناتا ہے تو ماتحت بھی خوش دلی سے مشکل سے مشکل کام کو کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، اس کے برخلاف اگر کام نہ کرنے پر وعید یا سزا سناتا ہے تو ماتحت کام کرتے ہیں لیکن بددلی کیساتھ۔

استاذ سبق یاد کرنے پر طلباء کو انعام کے طور پر کچھ دیتا ہے تو سارے طلباء خوب دلچسپی سے پڑھتے ہیں، اور اگر کوئی استاذ سبق یاد نہ کرنے والے طلباء کو سزا دیتا ہے تو پڑھنے والا طالب علم بھی بڑی بددلی سے استاذ کی مار کے خوف میں سبق یاد کرتا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ فرمائی کہ آپس میں ایک دوسرے کی بات مانا کرو، اختلاف سے بچو، اس لئے کہ اگر کسی جماعت یا گروہ میں اختلاف ہوتا ہے تو کام میں بڑی رکاوٹ آتی ہے، ہاں! رائے کا اختلاف ہونا برا نہیں، مشورہ سے کسی ایک رائے پر اتفاق کرلیا جاتا ہے، لیکن اختلاف رائے پر جمے رہنا کام کو بگاڑ دیتا ہے، اس لئے اساتذہ اور ذمہ دار آپس میں مشورہ کرکے اختلاف رائے کو ختم کرلیا کریں، بعض مرتبہ اختلاف رائے کی وجہ سے آپس میں رنجش ہوجاتی ہے، جو بغض، غیبت، کینہ، وغیرہ جیسی کئی نفسیاتی بیماری پیدا کرتی ہے ۔

خود آ گاہی:

بچوں کی نفسیات سے قبل استاذ کی خود اپنی نفسیات سے واقفیت خود آ گاہی کہلاتا ہے۔ بچوں کی نفسیات سے قبل استاذ اپنی نفسیات سے واقف ہو، اس کے لیے اپنی نفسیات کا خود مطالعہ کرنا یا کسی سے اپنی نفسیات کا مطالعہ کروانا۔

مندرجہ ذیل چار نکات سے نفسیاتی مطالعہ کرے۔

(ا) سیرت (٢) کارکردگی (٣) اخلاق (٤) وضع قطع

(۱) سیرت:

عام طور پر سیرت نگاری میں زندگی کے حالات بیان کئے جاتے ہیں،لیکن نفسیات کے مضمون میں سیرت سے مراد کسی شخص کے مزاج، جذبات، انداز گفتگو وغیرہ کا مطالعہ کرنا اور کمزوریوں کا دور کرنا، اچھائیوں کو بڑھانا۔

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

ایک استاذ کو سب سے پہلے اپنے مزاج کا مطالعہ کرنا چاہیے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کو جلد غصہ تو نہیں آتا ہے، اگر اس کا مزاج سخت وگرم ہے تو یہ تعلیم وتربیت میں نقصاندہ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے حضورﷺ کے مزاج کی تعریف فرماتے ہوئے کلام پاک میں فرمایا **ولو کنت فظاغلیظ القلب لانفظوا من حولک**

اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ صحابہ تمہارے قریب جمع نہ ہوتے۔

اس لئے ایک استاذ کو اور خاص طور پر مدارس اور مکاتب کے اساتذہ کو سخت مزاجی وگرم مزاجی سے پرہیز کرنا چاہیے، خود کو بتکلف خاموش مزاج بنانا چاہیے، حدیث پاک میں غصہ کو قابو میں کرنے کے جو طریقے بتائے گئے ہیں اسے اختیار کرنا چاہیے، یہ سوچنا چاہیے کہ ایک طبیب مریض کے علاج کے وقت اس پر خفا نہیں ہوتا اسی طرح ہم ان طلباء کے طبیب ہیں ہمیں ان پر غصہ نہیں ہونا چاہیے ایک ہے غصہ ہونا، دوسرا ہے غصہ کا اظہار کرنا ،اگر کوئی کسی پر غصہ ہوتا ہے تو اس کو اپنے نفس پر قابو نہیں ہوتا ہے جب مارتا ہے تو بے تحاشا مارتا ہے جس سے بچوں کو جسمانی نقصان پہونچتا ہے بعض بچے ایسی مار سے تعلیم ترک کردیتے ہیں لیکن کبھی کبھی تربیت میں غصہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔حدیث پاک میں حضورﷺ کے اظہار غصہ کے واقعات ملتے ہیں، جن میں لوگوں کی تربیت مقصود ہوتی تھی، جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھی مرارہ ابن ربیعؓ اور ہلال ابن امیہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے غصہ کا اظہار فرمایا۔

ایک استاذ کو اپنے جذبات پر قابو کرنا چاہئے، اگر جذبات پر قابو نہیں ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ لالچ کے جذبات کی وجہ سے امیر گھرانے کے طلباء کی طرف میلان زیادہ ہوگا جس کی وجہ سے غریب گھرانے کے بچوں کو یہ محسوس ہوگا کہ استاذ ہم پر توجہ نہیں کرتے ہیں اس وجہ

سے تعلیم سے ان کی رغبت کم ہوجائے گی۔

اسی طرح غریب بچوں پر مہربانی کے جذبات اتنے زیادہ نہ ہوجائیں کہ امیر گھرانے کے بچے یہ محسوس کرنے لگیں کہ استاذ ہم پر توجہ نہیں کرتے ہیں اس وجہ سے تعلیم سے ان کی رغبت کم ہوجائے گی، بعض اساتذہ طلبہ کے سامنے اس طرح کہتے ہیں کہ امیر گھر کے بچے کہاں پڑھتے ہیں، اکثر غریب گھر کے بچے ہی پڑھ کر بڑے آدمی بنتے ہیں اس طرح کے جملے امیر گھرانے کے بچوں میں تعلیم کی نفرت پیدا کردیتے ہیں۔

بعض مرتبہ استاذ میں حسن پرستی کے جذبات ابھرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ خوبصورت بچوں کی طرف مائل ہوتا ہے اس سے بہت سی اخلاقی برائیاں وجود میں آتی ہیں ،جو استاذ کے کردار کو خراب کرتی ہیں اور اس کے برے اثرات طلبہ پر بھی پڑتے ہیں، اس لئے ایک اچھے معلم کو اس طرح کے جذبات پر قابو پانا چاہیے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھے گا تو اگر وہ عمارت ثریا ستارہ تک بھی بنائے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی سیدھی نہیں ہوگی۔

مکتب کا استاذ بچہ کی شخصیت کی تعمیر کرنے کے لئے خشت اول رکھ کر بنیاد بناتا ہے، بنیاد رکھنے میں خامیاں اور کمزوریاں ہوں گی تو آخر عمر تک وہ باقی رہتی ہیں، اس لئے مکتب کے استاذ کو بہ نسبت مدرسے اور جامعات کے استاذ سے زیادہ فکر مند اور محنتی ہونا چاہئے۔

(۲) کارکردگی:

مکتب کے معیار کو بلند کرنے کے لئے استاذ کو اپنی کارکردگی بہتر بنانا ہوگا اگر کارکردگی میں کمی واقع ہوگی تو تعلیمی معیار گھٹے گا اس لئے ایک استاذ کو اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کی پابندی کرنا چاہیے۔

(۱) وقت کی پابندی: اگر استاذ وقت کی پابندی نہیں کرے گا تو طلبہ بھی نہیں کریں گے۔

(۲) فکر مند ہونا: اگر استاذ سست اور بے فکر ہوگا تو بچے بھی پڑھنے میں سست اور بے فکر ہوں گے۔

(۳)مقدار خواندگی :نصاب مکمل کرنے کے لئے مقررہ خواندگی کے مطابق سبق پڑھایا جائے اس طرح تعلیمی کارکردگی صحیح ہوگی۔

(۴)امتحان: ہر ماہ استاذ جائزہ لیتا رہے تو ششماہی امتحان اور سالانہ امتحان میں طلبہ کا نتیجہ اچھا آئے گا۔

(۳)اخلاق:

حضورﷺ نے فرمایا مامن شیء أثقل فی المیزان من حسن الخلق [أبوداؤد :٤٧٩٩]

میزان میں خوش اخلاقی سے بہتر کوئی چیز زیادہ وزنی نہیں،

اچھا برا نہ کہہ دو تم ظاہری بناپر
اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہے جوہر

ہر مدرسہ کے استاذ کو بااخلاق ہونا چاہیے اس لئے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے اگر بداخلاقی کرے گا جیسے گالی دینا تو طلباء بھی اس کی نقل میں بداخلاق بن جائیں گے،غیبت گالی گلوچ، بدتمیزی کو وہ برا نہیں سمجھیں گے۔

اگر معلم حلیم اور بردبار ہو تو وہ نہ صرف بچوں کا دل جیت لے گا بلکہ محلّہ کے لوگوں کا بھی محبوب بن جائے گا اس لئے اپنے اندر حلم کو تلاش کرے، اگر حلم کو نہ پائے بلکہ خود کو الجھنی اور غصہ ور پائے تو اس کا علاج کرے، غصہ دور کرنے کی حکمتیں حدیث شریف میں ہیں وہ اختیار کرے غصہ سے متعلق بزرگوں کے مضامین کا مطالعہ کرے۔

جو معلم یہ چاہتا ہو کہ وہ لوگوں میں محبوب ہوجائے تو اس کو چاہیے کہ تواضع وانکساری اختیار کرے حضرت رسول اللہﷺ نے امت کو اس کا نسخہ سکھادیا، فرمایا: من تواضع لله رفعه الله فهو فی نفسه صغیر وفی أعین الناس عظیم ومن تکبر وضعه الله فهو فی أعین الناس صغیر وفی نفسه کبیر حتی لهو أهون علیهم من کلب أو خنزیر ، جو شخص اللہ کے لئے تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالی اس کو رفعت بخشتے ہیں وہ اپنی نظر میں چھوٹا ہوتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں عظیم ہوتا ہے ، جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ تعالی اس کو لوگوں کی نگاہ میں چھوٹا بنادیتے ہیں حالانکہ وہ خود کو بڑا

سمجھتا ہے لوگوں کے نزدیک وہ ایک کتے یا سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔متواضع علماء کی نشانی یہ ہے کہ اگر ان کی کوئی غلطی بتائے تو وہ اپنی اصلاح سے شرماتے نہیں فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں صحیح بات کو بلاچوں چرا قبول کرلیتے ہیں،

جذبۂ خدمت :

جس معلم میں جذبہ خدمت نہیں ہوتا تو اکثر ادارہ کے ذمہ دار اس سے نالاں رہتے ہیں وہ یہ سوچتا ہے کہ میرا کام تو صرف پڑھانا ہے اور پڑھانے کی تنخواہ ملتی ہے کیوں پنکھے بند کروں، جھاڑو میں کیوں لگاؤں چٹائی یا ٹاٹ پٹی کیوں بچھاؤں، کیا میں چپراسی ہوں؟ تو یہ جذبہ عجب ہے معلم کو اپنے اندر خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے سید القوم خادمهم۔

جذبۂ ایثار:

معلم کو چاہیے کہ اپنے اندر جذبہ ایثار کو جگائے، اپنی ضرورتوں اور تقاضوں کو دبا کر ادارے کے تقاضوں کو پورا کرنا ایثار ہے ورنہ خودغرضی ہے۔

وضع قطع:

پھریوں ہوا کسی نے بٹھایا نہ پاس میں
دھبے لگے ہوئے تھے ہمارے لباس میں

معلم کو اپنی وضع قطع کا خیال رکھنا چاہیے، آئینہ کے سامنے صرف اپنے ہی بالوں کو نہیں سدھارنا چاہیے، بلکہ اپنے کپڑے وغیرہ کو بھی سنوارنا چاہیے تاکہ وہ باسلیقہ نظر آئے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالی عنہا کے یہاں ایک خاص عمدہ لباس تھا جب باہر سے وفود آتے تو آپﷺ اسے زیب تن فرما کر ان سے ملاقات کرتے، دینی ادارہ کے معلم کی حیثیت سے اس بات کا بھی اہتمام چاہیے کہ شرعی لباس زیب تن کرے، لباس سادہ ہو بہت رنگین لباس سے پرہیز کرے اور چہرہ مہرہ سنت کے مطابق بنائے، ڈاڑھی ایک مشت سے کم نہ تراشے۔

حافظه :

حافظہ ہمارے ذہن کی وہ قوت ہے جس کے ذریعے ہم پیش آمدہ باتوں واقعات

تجربات اور اشکال وغیرہ کو ذہن میں جماتے دوبارہ ذہن میں لاتے اور سابقہ کی حیثیت سے انہیں شناخت کرتے ہیں، حافظے کی اہمیت وافادیت محتاج بیان نہیں اس کے بغیر ہم ایک قدم چل نہیں سکتے، ذرا غور فرمائیے اگر ہم اپنے سابقہ تجربات بھولتے جائیں ہمیں اپنے وعدے، قرض اور لین دین کے معاملات یاد ہی نہ رہیں، مختلف مقامات، وہاں تک آنے جانے کے راستے، جانی پہچانی صورتیں، لوگوں سے رشتے ناطے اور ان کی باتیں اور شکلیں اگر ہمارے ذہن سے محو ہو جائیں یا خدا رسول ﷺ کی ہدایات اگر ہمیں یاد ہی نہ رہیں تو سوچیے زندگی دوبھر اور وبال جان ہو جائے، حافظے کے بغیر ہم جن زحمتوں سے دوچار ہو سکتے ہیں، ہر ایک اس کا بآسانی اندازہ کر سکتا ہے۔

حافظہ ایک فطری قوت ہے اس کا تعلق دماغ کی طبعی ساخت سے ہے اس لیے اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کا سوال نہیں جیسا کہ باری تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جائے ویسا ہی برقرار رہے گا، البتہ اگر اس سے کام لینے کا سلیقہ آتا ہو تو معمولی حافظے کا آدمی بھی انشاء اللہ اپنا کام بہ خوبی چلا سکتا ہے اس لیے اس قوت سے مناسب کام لینے کا طریقہ ہر ایک کو جان لینا چاہیے۔

بچپن میں قوت حافظہ سے خوب کام لیا جائے اور بہت سی ضروری چیزیں (کلام پاک، دعائیں، اذکار، اشعار، ضرب الامثال، اقوال وغیرہ) بہ خوبی یاد کرادی جائیں، اگر سات آٹھ سال کے بچے کو شفقت، محبت اور سلیقے سے حفظ کرایا جائے اور ساتھ ہی روزانہ تھوڑا سا وقت دے کر مادری زبان لکھنے پڑھنے اور معمولی حساب کرنے کی مشق بہم پہنچائی جائے تو وہ دس گیارہ برس کی عمر میں حافظ قرآن بھی ہو سکتا ہے اور ان بچوں کے ساتھ آئندہ بآسانی چل سکتا ہے جو شروع سے تمام مضامین لیکر چل رہے تھے اور حفظ کی سعادت سے محروم رہ گئے ہیں۔

یاد کرانے کے طریقے اور تدبیریں:

یاد کرانے کے مندرجہ ذیل طریقے اور تدبیریں تجربے سے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں، ان کو اپنانے سے جلد یاد ہو جاتا ہے، دیر تک یاد رہتا ہے اور بوقت ضرورت یاد

آجاتا ہے۔

(۱) ہشاش بشاش اور تازہ دم ہونے پر یاد کرانا چاہیے: تکان، بیزاری صدمے کی حالت میں کچھ حفظ کرانا صحت کے لیے مضر بھی ہوتا ہے اور کافی وقت اور محنت صرف کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی، اس لیے ہمیشہ ایسے وقت یاد کرایا جائے جب دماغ تروتازہ ہو۔

(۲) اجزا کے بجائے کل کو یاد کرانا چاہیے: یعنی پوری چیز کو اجزا میں تقسیم کر کے یاد کرانے کی بجائے پوری ایک ساتھ یاد کرانے کی کوشش کی جائے، اگر کوئی چھوٹی سورت، چھوٹا رکوع، مختصر دعا، چند اشعار کی نظم یا مختصر عبارت یاد کرنی ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ مکمل ایک ساتھ یاد کرائی جائے، پوری سورت، رکوع یا نظم کو بار بار پڑھایا جائے، جو حصے یاد ہوتے جائیں ان کو بغیر دیکھے ہوئے باقی دیکھ دیکھ کر دہرایا جائے تھوڑی دیر میں مکمل یاد ہو جائے گی، ایک ایک فقرہ یا مصرعہ الگ الگ یاد کرا کے جوڑنے میں روانی بھی نہیں آتی اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔

(۳) کل کو مناسب اجزا میں تقسیم کر کے یاد کرانا چاہیے: اگر سورت، نظم، یا تقریر یا عبارت لمبی ہو تو ایک دوبار پڑھوا کر مفہوم بہ خوبی سمجھنے دیا جائے پھر اسے مناسب اجزا میں تقسیم کر کے اوپر کے طریقے سے یاد کرایا جائے، اجزا ایسے ہوں کہ ہر جز میں ایک پوری بات آجاتی ہو، مثلاً پانچ بند کی کوئی نظم یاد کرانی ہو تو ہر بند کو ایک جز مانا جائے، البتہ ہر جز کے آخری لفظ کا اس کے بعد کے جز کے پہلے لفظ سے ربط کر دیا جائے تا کہ تسلسل اور روانی برقرار رہے۔

(۴) وقفوں سے یاد کرانا چاہیے: ایک ہی نشست میں کل یاد کرانے کے بجائے اگر وقفہ دے کر یاد کرایا جائے تو بہت مستحکم یاد ہوتا ہے اور مدتوں نہیں بھولتا، اس میں وقت بھی کم لگتا ہے کیوں کہ ہر نشست میں دماغ تروتازہ ہوتا ہے اور چستی ومستعدی سے حفظ کرتا ہے، نیز وقفہ دینے سے یاد کی ہوئی باتوں کو ذہن میں جڑ پکڑنے کا موقع ملتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اعادہ کرنے سے تذکر میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

(۵) حفظ کے بعد کچھ دیر خالی رکھنا چاہیے: ذہن کو مسلسل کام پر لگائے رکھنے سے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے اس لیے کچھ یاد کرا لینے کے بعد ذہن کو یاد کی ہوئی چیز کو جمانے کا

کچھ موقع دینا چاہیے۔

(۶) یاد کیے ہوئے مواد کا اعادہ ہوتے رہنا چاہیے: یاد ہونے کے بعد کچھ تو ایک ہی دن میں اور بہت سا تین چار دن میں بھول جاتا ہے، اس لیے حفظ کرا لینے کے بعد مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ تین چار دن تک مسلسل اعادہ کراتے رہنا چاہیے تا کہ اچھی طرح یاد ہو جائے اور بھولنے کا اندیشہ نہ رہے۔

(۷) یاد کرانے سے پہلے ذہن کو اس کے لیے بہ خوبی آمادہ کر لینا چاہیے: جو کچھ یاد کرانا ہو اس کی افادیت واہمیت ذہن نشین کرانے اور دل چسپی پیدا کر دینے کے بعد یاد کرانا چاہیے ،طبیعت جتنی زیادہ آمادہ ہوگی یاد کرنے میں اتنی ہی زیادہ آسانی ہوگی۔

حافظے میں اگر مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جائیں تو وہ اچھا حافظہ کہلاتا ہے۔

(۱) جلد یاد کر لینا، (۲) بوقت ضرورت یاد آ جانا، (۳) دیر تک یاد رکھنا، (۴) بیکار باتوں کو بھول جانا۔

حافظہ کی قسمیں:

حافظے کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) **فوری حافظہ** :یعنی وہ یادداشت جو وقتی طور پر کام دیتی ہے اور کام ختم ہونے کے بعد یاد کی ہوئی باتوں کو ذہن سے محو کر دیا جاتا ہے مثلاً مکالمہ میں اپنا پارٹ کوئی تقریر جو کسی خاص موقع کے لئے تیار کی گئی ہو۔

(۲) **دیرپا حافظہ** :وہ یاداشت جو مستقل طور پر کام دیتی ہے، مثلاً الفاظ کے معانی ، پہاڑے گر، فارمولے، تاریخی واقعات وسنین وغیرہ۔

(۳) **رٹو حافظہ** :جس میں لفظ بہ لفظ رٹ کر حسب ضرورت بعینہ دہرا دیا جاتا ہے اس طرح کی یادداشت میں مفہوم پر توجہ دینا ضروری نہیں ہوتا بچے اکثر بغیر سمجھے بوجھے رٹ لیا کرتے ہیں۔

(۴) **منطقی حافظہ** :جس میں الفاظ کے بجائے مفہوم ذہن نشین کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت اپنے الفاظ میں پوری بات دہرا دی جاتی ہے۔

(۵) **تیز حافظہ**:یعنی کم وقت میں یاد کر لینے کی صلاحیت۔

(۶) **سست حافظہ** :کافی وقت صرف کرنے کے بعد یاد کرنے پر قادر ہونا۔

(۷) **مخصوص حافظے** :بعض لوگ بصری شبیہات کو بآسانی یاد کر پاتے ہیں، بعض سمعی کو، جو لوگ بصری حافظے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ جب تک عبارت کو خود نہ پڑھ لیں زبانی سن کر یاد نہیں کر سکتے ایسے لوگ استحضار کے وقت کتاب کے صفحات اور سطروں کو یا تختہ سیاہ کی پوری تصویر اور اس پر لکھے ہوئے لفظ یا جملے کی شبیہ ذہن میں لاتے ہیں، بعض حافظ قرآن سناتے وقت ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ قرآن دیکھ کر پڑھ رہے ہیں یہاں تک کہ ورق الٹا نظر آتا ہے ایسا حافظہ رکھنے والوں کو شکلیں یاد رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، چناں چہ جس سے ایک بار مل لیتے ہیں انہیں مدتوں بعد بھی بآسانی پہچان لیتے ہیں اس کے برعکس سمعی حافظہ رکھنے والے سن کر بآسانی یاد کر لیتے ہیں اور بعینہ دہرا دیتے ہیں، ایسے لوگ قرأت اشعار، راگ، گیت کی نقل بآسانی اتار سکتے ہیں۔

(۸) **بے ربط حافظہ** : چھوٹے بچوں کے حافظے میں کوئی ربط نہیں ہوتا وہ متعدد بے ربط الفاظ اور جملے وغیرہ یاد کر لیتے ہیں ابتدا میں وہ کئی سال تک اسی بے ربط حافظے سے کام چلاتے ہیں اس کے بعد تجربے اور غور وفکر میں اضافے کے ساتھ ان بے ربط باتوں میں ربط وتعلق ملانا سیکھتے ہیں۔

معلم کی شخصیت اور اوصاف:

معلم کا درجہ بہت بلند ہے وہ طلبہ کا روحانی باپ اور ملت کا معمار ہے آئندہ نسلوں کی سیرت سازی اسی کی ذمہ ہے، مستقبل کے شہریوں کا بننا بگڑنا بہت کچھ اسی کی کوششوں پر منحصر ہے ایک معلم کو طلبہ سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کے سرپرستوں سے بھی ذمہ داران ادارہ سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور عام پبلک سے بھی ،ان میں سے ہر ایک کی نگاہیں معلم میں کچھ اوصاف تلاش کرتی ہیں جو بہ ہر حال ناگزیر بھی ہیں، معلم کو اپنے اندر ان اوصاف کو پروان چڑھانے کی فکر کرنی چاہیے تا کہ وہ اپنے فرائض کو بھی کما حقہ انجام دے سکے اور ان سب کو مطمئن کر سکے۔

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اوراس کی ذاتی اوصاف کا رول سب سے اہم ہوتا ہے،طلبہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ زندگی بھر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے

(۱) آپ ﷺ کی شخصیت کے مندرجہ ذیل چند پہلوؤں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے تا کہ ہر معلم ان کی روشنی میں اپنی شخصیت کو ڈھال سکے اور اپنا قابل تقلید اسوہ طلبہ کے سامنے پیش کر سکے۔

(۲) آپ ﷺ کی شخصیت بڑی دلکش،محبوب اور موثر تھی، جو دیکھتا بے اختیار کھنچتا، اپنی جان چھڑکتا اور آپ ﷺ کے اشاروں پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی کوشش کرتا، معلم کو بھی اپنے اندر ان اوصاف کی جھلک لانی چاہیے تا کہ طلبہ اس سے بدکنے کے بجائے قریب آئیں توجہ اور دلچسپی سے بات سنیں اور معلم کا اثر قبول کریں،ان اوصاف کے بغیر معلم اپنا فرض بخوبی انجام دے ہی نہیں سکتا۔

(۳) زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں آپ ﷺ کا اسوہ قابل تقلید تھا پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی،ظاہر باطن یکساں تھا،جن باتوں کی تعلیم دی خود اس پر عامل رہے ،زبان سے جو کچھ فرمایا اس پر عمل کر کے دکھایا۔

(۴) طلبہ بھی معلم کی باتوں سے زیادہ اس کے اسوہ کی تقلید کرتے ہیں اس لیے معلم کو بھی اپنی سیرت کے تمام پہلوؤں پر برابر نظر رکھنی چاہیے تا کہ طلبہ کو تقلید کے لیے اچھا اسوہ ملے ورنہ اپنی کوتاہیوں کا وبال تو ہوگا ہی غلط اسوے کا جو طلبہ پر پڑے گا اس کا وبال بھی معلم پر ہوگا۔

(۵) ذات گرامی ﷺ علم وحکمت کی حامل تھی معلم کو بھی صاحب علم وحکمت ہونا چاہیے کیوں کہ صحیح اور پختہ علم کے بغیر طلبہ کو اچھی تعلیم نہیں دی جاسکتی اور حکمت کے بغیر سلیقے سے ان کی تربیت نہیں کی جاسکتی، تربیت کا کام تو غیر معمولی حکمت ودانائی چاہتا ہے معلم کو اپنے علم میں اضافے اور پختگی نیز اپنی معلومات پر بھروسہ اور یقین پیدا کرنے کی برابر جدوجہد کرتے رہنا چاہیے،علم کے معاملے میں طلبہ اپنے معلمین ہی کو سند سمجھتے ہیں اگر معلم کو خود اپنے علم پر بھروسہ اور یقین نہ ہو تو طلبہ کا اعتماد متزلزل ہوگا اگر کسی معاملہ میں صحیح معلومات نہ ہو تو غلط

سلط باتیں بتانے کے بجائے خندہ پیشانی سے عدم واقفیت کا اعتراف کر لینا چاہیے اور معلومات حاصل کر کے بعد میں بتا دینا چاہیے اس سے طلبہ کا اعتماد بحال رہے گا اور معلم غلط بیانی کے اس وبال سے بھی محفوظ رہے گا جس کی طرف ذیل کی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

عفوودرگذر اور تحمل وبردباری میں حضور ﷺ اپنی مثال آپ تھے،معلم کو بھی نادان بچوں سے سابقہ پیش آتا ہے جن سے ہمہ وقت غلطیاں وکوتاہیاں اور خلاف طبع حرکات سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے اس لیے وہی معلم کامیاب ہوسکتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں، چڑچڑے اور غصہ ور لوگ کبھی اچھے معلم نہیں ہوسکتے ۔

صورت حال کیسی بھی پیچیدہ ہو معاملات کو آپ ﷺ بڑی دور اندیشی اور سہولت سے سلجھا دیتے،آپ ﷺ کے چند جملے آگ پر پانی کا کام کرتے اور ہر فریق مطمئن ہو جاتا معلم کو بھی آئے دن درسگاہوں اور باہر بھی طرح طرح کے معاملات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر نمٹنے کی صلاحیت نہ ہو تو معلم کو بڑی دشواری پیش آئے گی۔

بچوں سے آپ ﷺ کو غیر معمولی انس اور طبعی مناسبت تھی،ان کی بچکانہ حرکات کی آپ ﷺ بہت زیادہ رعایت کرتے تھے آپ ﷺ نے کبھی کسی بچے کو نہیں پیٹا اور مارنے کے لئے کہا بھی ہے تو آخری چارہ کار کے طور پر، معلم کو بھی اپنے اندر ان صفات کو پروان چڑھانا چاہیے،اگر بچوں سے انس اور لگاؤ نہ ہو تو انسان معلّمی کا پیشہ اختیار نہ کرے۔

لباس میں سادگی،تواضع اور بے تکلفی کے ساتھ آپ ﷺ طہارت ونظافت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے،معلم کو بھی فیشن اور نقالی سے پرہیز کرنا چاہیے،سادگی اور صفائی ہی میں علم کی شان ہے۔

معلم کی آواز:

سبق کے موثر اور کامیاب ہونے کا بہت کچھ انحصار معلم کی آواز پر ہوتا ہے،آواز اگر جاذب توجہ،خوشگوار اور میٹھی ہو تو طلبہ بآسانی متوجہ ہوتے ہیں اور درس میں دیر تک تکان یا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے،آواز اگر کرخت ہو یا معلم بہت زیادہ چیخ کر بولے تو کانوں کو

برا لگتا ہے ،طلبہ جلد اکتا جانے اور تکان محسوس کرنے لگتے ہیں ،کرخت آواز سے ابتدائی درجات کے چھوٹے بچوں پر تو مسلسل خوف کا جذبہ طاری رہتا ہے اور وہ معلم کی بات پر قطعا توجہ نہیں دے پاتے اور نہ ان کی سمجھ میں پوری بات آتی ہے خود معلم کی صحت کے لیے چیخنا چلانا بہت مضر ہے گلا بھی خراب ہوجاتا ہے اور پھیپڑے بھی بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں ،اسی طرح بہت زیادہ بولنا اور بغیر ضرورت بولتے رہنا توجہ اور دلچسپی کو ختم کردیتا ہے، بات خواہ کتنی زوردار اور موثر کیوں نہ ہو بغیر اتار چڑھاؤ کے ایک ہی سر میں پیش کی جائے تو وہ غیر مؤثر ہوجاتی ہے۔

حضورﷺ کی آواز نہ بہت بلند ہوتی نہ بہت پست بلکہ میانہ ہوتی تھی جو کانوں کو بہت خوشگوار معلوم ہوتی البتہ حسب ضرروت اتنی بلند آواز سے بولتے کہ مخاطب سن سکے ،معلم کو بھی اپنی آواز نہ اتنی بلند رکھنی چاہیے کہ کانوں کو بری لگے اور نہ اتنی پست کہ سنائی نہ دے اور درجے کا نظم وضبط متاثر ہو بلکہ اتنی ہو کہ پورا درجہ بآسانی سن سکے ،چیخنا چلانا یا کرخت آواز سے بولنا کسی طرح درست نہیں گدھے کی آواز کی تو خود قرآن نے بھی مذمت کی ہے: **ان انکر الأصوات لصوت الحمیر** بے شک گدھے کی آواز سب سے ناپسند ہے۔

ابتداء سے انتہا تک آپﷺ منھ بھر کر بولتے تھے (یہ نہیں کہ آدھی بات اندر رہ گئی) معلم کو بھی اس کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

دیگر تمام امور کی طرح حضورﷺ کی آواز میں بھی تکلف وتصنع بالکل نہ تھا، معلم کو بھی اپنی آواز میں بے ساختہ پن اور بے تکلفی برقرار رکھنی چاہیے، انداز فطری ہونا چاہیے بعض اساتذہ منھ ٹیڑھا کرکے بولنے اور آواز میں تصنع پیدا کرنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں ،حالاں کہ اپنی ان حرکات سے وہ طلبہ کی نظروں میں مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔

معلم کی زبان:

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی زبان کو بھی بہت زیادہ دخل ہوتا ہے کیوں کہ یہی تو وہ اہم آلہ ہے جس کے ذریعے طلبہ تک معلم اپنی بات پہنچاتا اور اپنے خیالات وجذبات

منتقل کرتا ہے، دوسرے خود طلبہ ارادی اور غیر ارادی طور پر معلم کی زبان کی تقلید کرنے لگتے ہیں اس لیے معلم کو زبان کے استعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیے، اگر معلم کی زبان ناقص ہوگی تو طلبہ بھی ناقص زبان استعمال کرنے لگیں گے اور بات بھی پورے طور پر سمجھ میں نہ آئے گی، حضورﷺ بہت ہی صاف، سادہ، عام فہم اور سلیس زبان استعمال فرماتے، مرصع ومسجع عبارت بولنے اور پر تکلف زبان استعمال کرنے سے گریز کرتے، کوئی بھی مسئلہ ہو ایسی زبان میں بیان فرماتے کہ ان پڑھ اور معمولی صلاحیت کے لوگ بھی بہ خوبی سمجھ لیتے، معلم کو بھی چھوٹے بچوں سے سابقہ پیش آتا ہے جن کا ذخیرہ الفاظ بہت محدود ہوتا ہے اگر بولنے میں اس کی رعایت نہ کی جائے تو بچے سمجھ ہی نہ سکیں گے ۔

فصاحت وبلاغت کا بھی حضورﷺ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا فرماتے، جملہ مختصر اور الفاظ جامع ہوتے، اس کے باوجود مطلب پوری طرح واضح ہوجاتا، معلم کو بھی چاہئے کہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے جملوں اور کم سے کم الفاظ میں اپنی بات واضح کرے، جملے مربوط اور موضوع سے متعلق اور حشو وزائد سے پاک ہوں۔

مربی کا رویہ:

علاوہ ازیں تربیت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے مربی کو اپنے رویے میں بھی اصلاح کرنی ہوگی۔

(۱) بچے کے لیے اپنے اندر محبت، ہمدردی ودل سوزی کے جذبات پیدا کرنے ہونگے۔

(۲) اس کی کوتاہیوں کی چبھن محسوس کرکے ازالے کی فکر کو اپنا فریضہ سمجھنا ہوگا۔

(۳) دل میں اس کی اصلاح کا صحیح جذبہ پیدا کرنا اور پر خلوص کوششوں کے ساتھ اللہ تعالی سے اپنی اور بچے کی ہدایت کے لئے دعا کرتے رہنا ہوگا۔

(۴) اصلاح کی طرف سے مایوسی سے خود بھی بچنا ہوگا اور بچے کو بھی محفوظ رکھنا ہوگا بچہ بہ ہر حال بچہ ہے اس سے بہت زیادہ یا بہت اونچی توقعات وابستہ کرلینے سے بھی مایوسی ہوتی ہے کیوں کہ طفلانہ حرکات بچوں سے بہ ہر حال سرزد ہوں گی توقعات اونچی ہوں گی تو

ایسی حرکات سے مایوسی ہوں گی اس لیے اس سے گریز کرنا ہوگا۔

(۵) حتی الامکان حسن ظن سے کام لینا ہوگا کیوں کہ بچہ کو جیسا سمجھا یا جاتا ہے ویسا ہی وہ بنتا ہے مگر اس کے معنی احتیاط ونگرانی کی طرف سے غفلت ہرگز نہیں ہے بلکہ سوءظن، تجسس اور عیب چینی سے گریز ہے۔

(۶) بچے کی عزت نفس، غیرت اور خودداری کا پاس لحاظ کر کے تمسخر، استہزا، طعن وتشنیع لعنت وملامت وغیرہ سے گریز کرنا ہوگا۔

(۷) حاکم عدالت کے بجائے مصلح اخلاق کا رویہ اپنانا ہوگا یعنی ماضی کی خطاؤں پر سزا دے کر مطمئن ہوجانے کے بجائے اصل اسباب ومحرکات کا پتہ لگا کر ان کے ازالے کی فکر وتدبیر کرنی ہوگی تاکہ مستقبل میں ان کوتاہیوں کا اعادہ نہ ہو، جو ہوگیا سو ہوگیا آئندہ کے لیے صدق دل سے توبہ کرالی جائے۔

(۸) جب تک خود مربی اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ دے گا اور اپنے رویے میں مناسب تبدیلی نہ کرے گا بچوں کی اصلاح وتربیت کے ضمن میں اس کی کوششیں ہرگز بارآور نہ ہوں گی۔

کامیاب استاذ بننے کے کچھ اصول:

ایک معلم اسی وقت کامیاب ترین استاذ بن سکتا ہے جبکہ وہ چاق وچوبند ہو، خوش مزاج ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھے۔

(۱) نفسیاتی مطالعہ :

علم نفسیات کو بروئے کار لائے اور اپنا، طلباء اور اردگرد رہنے والوں اور اطراف کے ماحول کا گہرا مطالعہ کرتا رہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہے، ہر طالب علم کی نفسیات کو سمجھ کر اس سے برتاؤ کرے۔

(۲) سستی اور کاہلی :

بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے
بے کاوش جاں علم وہنر کس کو ملا ہے

سستی اور کاہلی ایک طرح کی نفسیاتی بیماری ہے جو کام میں حارج ہوتی ہے، جو باصلاحیت انسان کو بے کار کر کے رکھ دیتی ہے، بعض لوگ بڑی عبقری اور قائدانہ صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں، لیکن سستی اور کاہلی کی نفسیاتی بیماری کی وجہ سے ذرہ بے مایہ ہو کر گمنامی کا شکار ہوجاتے ہیں ہر کام میں چستی اور حکمت عملی سے کام کرے، آج کا کام کل پر نہ ٹالے۔

رسول اللہ ﷺ نے سستی کاہلی سے نجات حاصل کرنے کے لیے امت کو دعاء سکھائی ہے **اللھم انی أعوذبک من العجز والکسل والجبن والبخل والھرم وعذاب القبر وفتنة الدجال .**

اے اللہ! معذوری، سستی، بزدلی، کنجوسی، ضعیفی، عذاب قبر اور دجال کے فتنے سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

(۳) اپنی خدمت آپ :

استاذ کو طلبہ سے ذاتی خدمت لینے میں احتیاط کرنا چاہیے، اپنا کام خود کرے، ہمارے اسلاف کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اپنی خدمت آپ کا سبق ملتا ہے، ایک واقعہ پیش ہے: علامہ ابوالاسود رحمۃ اللہ علیہ (علم نحو کے سب سے پہلے مرتب) اپنا کام خود کرنے کے اتنے عادی تھے کہ اخیر عمر میں فالج زدہ ہونے کے باوجود مفلوج خود گھسیٹتے ہوئے بازار سے اپنی ضروریات کو خرید لاتے حالانکہ اس زمانہ میں ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔

طلباء کی تربیت کے لیے خدمت کا کام لینا مقصود ہو تو اس میں چار باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، (۱) ایسا کام نہ لے جو وہ پورا نہ کرسکے اور اس کے لیے بوجھ ہو، (۲) کام لینے کے بعد اس کی تلافی کے طور پر کچھ انعام دیدے (۳) امرد طلباء سے تنہائی میں کوئی کام لینے سے احتراز کرے، (۴) ایسے طلباء سے کوئی بدنی خدمت لینے سے بھی پرہیز کرے۔

(۴) مایوسی:

مایوسی ایک نفسیاتی بیماری ہے، قرآن پاک میں اللہ نے فرمایا **قل یعبادی الذین أسرفوا علی أنفسھم لا تقنطوامن رحمة الله ،**

کہہ دو کہ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر رکھی ہے اللہ کی رحمت

سے مایوس نہ ہو۔

مایوسی تو اسلام میں کفر ہے ،ایک ماہر استاذ کبھی کسی طالب علم سے اکتا تا نہیں یا اس کی تعلیم وتربیت سے مایوس نہیں ہوتا، بلکہ ایسے مستی خور طلبہ جو پڑھائی سے منہ چراتے ہیں ان کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے ایک بچہ پڑھائی میں ذرا بھی جی نہیں لگاتا، بہت سے استاذ اس کی کند ذہنی سے تھک کر مایوس ہو چکے تھے اس کے پڑھے لکھے والدین بھی استاذ بدلتے بدلتے پریشان تھے کہ کیا ان کا بیٹا ان پڑھ ہی رہے گا ؟ آخر وہ بچہ ایک ایسے استاذ کے ہاتھ چڑھا جو بچوں کی نفسیات سے واقف تھا اس نے دو تین روز تک اس بچے سے دوستانہ انداز میں خوب باتیں کیں، گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بچہ کو کبوتر بازی کا بڑا شوق ہے استاذ نے تیس کبوتر خریدے اور ان کے لیے الگ الگ دربے بنوائے، پھر بچے سے کہا کہ ہم ان کبوتروں کا نام رکھ دیتے ہیں ایک سے تیس تک گنتیوں سے ان کے نام رکھ دئے، چند دنوں میں بچے کو تیس تک گنتی یاد ہوگئی، پھر چند ہفتوں کے بعد استاذ نے اس بچے سے کہا کہ چلو اب ہم کبوتروں کے نام بدل دیں چنانچہ تمام کبوتروں کا نام حروف تہجی پر رکھ دیا بچے کو چند روز میں حروف تہجی بھی یاد ہوگئے ایک ماہر استاذ کسی طالب علم سے پریشان نہیں ہوتا، نہ ہی کسی سے بددل ہوتا ہے، بلکہ طلباء کی کمزوریوں سے ہونے والی کبیدہ خاطری سے اپنے سینہ کو پاک رکھتا ہے، اور زبان حال سے یوں کہتا ہے:

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفراست درطریقہ ما کینہ داشتن

ہمارا قانون یہ ہے کہ آئینہ کی طرح سینہ رکھا جائے، ہمارا طریقہ یہ ہے کہ کینہ رکھنا کفر ہے۔

(۵) نظام الاوقات:

اپنے پورے چوبیس گھنٹے کا نظام الاوقات بنائے اور اسی کے مطابق روزمرہ کے جہاں بار بار نظر پڑتی ہوتا کہ یاد دہانی ہوتی رہے، اس نظام الاوقات کو اس ترتیب پر مرتب کرے کہ ایک ایک منٹ کا استعمال ہو، نظام الاوقات سے انسان بہت سے کام کی ذمہ داری اوڑھ سکتا ہے۔

(۶) **منصوبہ درس** : درس سے پہلے درس کی تیاری کو منصوبہ درس کہتے ہیں ،منصوبہ درس سے استاذ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور استاذ بچوں کو سبق با آسانی سمجھا سکتا ہے، مقدار خواندگی کے مطابق نصاب بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

(۷) **ورزش**: خود کو چست رکھنے کے لیے ایک معلم کو ہلکی پھلکی ورزش کرنی چاہیے عام طور سے مدارس کا کام زیادہ تر بیٹھ کر کرتا ہے، بدنی محنت کم اور دماغی محنت زیادہ کرنا ہوتا ہے اس لیے پیٹ کے امراض جیسے قبض، کثرت ریاح، ڈاہی برنا، وغیرہ بیماری لگ جاتی ہے ،اس لئے ورزش کے ذریعہ ایسی بیماریوں سے بچا جا سکتا ہے۔

بچوں کی تربیت:

بچوں کو بڑوں پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے ان کی دنیا ہی الگ اور نرالی ہوتی ہے آئے دن ان کا مشاہدہ ہے کہ بڑے سے بڑے واقعات وحوادث جن کے اثرات خود ان بچوں کی زندگی پر نہایت دوررس اور گہرے پڑنے والے ہوتے ہیں، ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ الٹا ان کی تفریح اور مسرت کا سامان بن جاتے ہیں، گھر میں آگ لگ جائے، چوری ہو جائے، یا گھر کے کسی ذمہ دار فرد کا انتقال ہو جائے ہو سکتا ہے بچہ دوسروں کو دیکھا دیکھی وقتی طور پر کچھ متاثر ہو کر دو چار قطرے آنسو بھی ٹپکا دے لیکن اصل دلچسپی انہیں اس ہنگامہ سے ہوتی ہے جو ایسے مواقع پر اعزہ واقارب، دوست واحباب اور پڑوسیوں نیز ان کے بچوں کے جمع ہو جانے سے گھر میں برپا ہوتا ہے ان حادثات کے مواقع پر بچوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیجئے صاف محسوس ہوگا کہ ان کے دل پر دراصل ان حادثات کا کوئی خاص اثر نہیں ہے موقع ملے تو وہ پوری دلجمعی سے اچھل کود اور شور شغب میں حصہ لیں گے، دراصل وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں بچہ ایک زندہ باشعور ہستی ہے اس کے اندر مختلف قسم کی قوتیں وصلاحیتیں ہوتی ہیں وہ کچھ بنیادی خواہشات وجذبات رکھتا ہے، اس کی اپنی پسند وناپسند اور اپنی دلچسپیاں اور ارادے ہوتے ہیں اس کے سوچنے سمجھنے محسوس کرنے اور متاثر ہونے سیکھنے اور عادی بننے متوجہ اور منہمک ہونے حفظ واعادہ کرنے کے مخصوص ڈھنگ ہوتے ہیں ، بلوغ تک پہنچنے اور بڑوں کی دنیا میں داخل ہونے تک اسے متعدد

مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، ہر مرحلہ کی کچھ اہم خصوصیات ہوتی ہیں اوران خصوصیات کے کچھ بنیادی تقاضے،تعلیم وتربیت کے سلسلے کی کوششیں اس وقت بارآور ہوسکتی ہیں جب ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

تربیت کے لغوی معنی پالنا پوسنا لیکن اصطلاح میں سیرت وشخصیت کو سنوارنا تربیت کہلاتا ہے،تربیت کا مقصود دراصل بچوں کو بتدریج ان اوصاف کا حامل بنانے میں مدد دینا ہے جو دونوں جہاں میں ان کی فلاح وکامرانی کے لیے ضروری ہے،ظاہر ہے یہ کام بہت ہی ہمہ گیر،محنت طلب اور صبر آزما ہے اس کے لیے بتدریج:

(۱) بچوں کا طرز فکر،نظریہ حیات اور معیار امتیاز وانتخاب ایسا بنانا ہوگا جو ان کے مقصد وجود سے مطابقت رکھتا ہو مختلف معاملات میں سوچنے کا ڈھنگ،زندگی کے بارے میں ان کا تصور اور برائی بھلائی کو پرکھنے کا معیار وہی بنانا ہوگا جو اللہ کے صالح بندہ کا ہونا چاہیے۔

(۲) ان کے تخیلات اعلی ،تصورات واضح ،تفکر منظم ،استدلال مربوط ،عقائد صحیح،تیقنات پختہ اور ارادے مضبوط بنانے ہونگے ،کیوں کہ یہی پختہ سیرت وکردار کی اساس ہیں۔

(۳) ان کی جبلتوں،خواہشوں اور میلانات میں انضباط پیدا کرنا ہوگا۔

(۴) ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی مناسب طریقے سے اصلاح کرنی ہوگی اوران پر قابو پانے کے لیے ان کے اندر خود اعتمادی اور ندامت کا جذبہ پروان چڑھانا ہوگا۔

(۵) انتہائی صبر واستقلال سے پسندیدہ عادت ڈلوانے اور ناپسندیدہ ترک کرانے ہوں گے۔

(۶) محبت وشفقت سے مختلف مواقع کے آداب اور طور طریقے سکھانے ہوں گے۔

(۷) ان کی استعداد کے مطابق مصروفیات ومشاغل اوران کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے تاکہ مناسب عملی تربیت ہو

والدین اور تربیت:

بچوں کے بناؤ بگاڑ پر سب سے زیادہ اثر انداز والدین ہی ہوتے ہیں کیوں کہ

بچوں کی شخصیت میں وہی رنگ وروغن بھرتے ہیں۔شکل وصورت کی طرح ان کے اخلاق وعادات،خیالات ومعتقدات،جذبات ومیلانات تک پر والدین ہی کا پرتو پڑتا ہے، بچے جو کچھ والدین خصوصا ماں کی گود میں سیکھ لیتے ہیں ساری زندگی اس کی گہری چھاپ برقرار رہتی ہے ،اسی لیے تربیت کی اصل ذمہ داری انہی پر ڈالی گئی ہے اور اس ضمن میں براہ راست اور سب سے زیادہ انہی سے بازپرس بھی ہوگی۔

ذمہ داریاں:

والدین کو چاہیے کہ:

ولادت کے بعد بچہ کو صاف ستھرا کر کے کانوں میں اذان دیں اور اچھا سا نام رکھیں۔

ساتویں دن عقیقہ کریں (بشرط استطاعت)۔

شفقت اور کشادہ دلی سے اسے پالیں پوسیں۔

حلال اور طیب روزی سے پرورش کریں۔

کھیلنے اور خوش رہنے کے کافی مواقع دیں۔

پیار محبت سے آداب وسلیقہ سکھائیں۔

پانچ/چھ سال کا ہو تو اسے شفیق وصاحب کردار معلم کے حوالے کریں۔

کھانے،کھیلنے نہانے دھونے،کام اور آرام کرنے کا ایسا پروگرام بنائیں جو صحت وبالیدگی میں معاون ہو رفتہ رفتہ اس پروگرام کا خوگر اور پابند بنائیں۔

سات سال کا ہو تو نماز پڑھا سکھائیں۔

دسویں سال اس کا بستر الگ کردیں۔

بارہویں سال سے اس کی حرکات وسکنات پر پوری نظر رکھیں ،غلطیوں اور کوتاہیوں کے صحیح اسباب کا پتا لگا کر اس کی حرکات وسکنات پر پوری نظر رکھیں،غلطیوں اور کوتاہیوں کے صحیح اسباب کا پتا لگا کر ازالے کی فکر کریں۔

عام طور پر اپنا رویہ نرم اور مشفقانہ رکھیں حتی الامکان عفو ودرگذر سے کام لیں۔

ناگزیر ہوتو سزا سے بھی گریز نہ کریں لیکن جلد ہی حسن سلوک سے اس کی تلافی کردیا کریں۔

بڑا ہوتو بہادری، پامردی اور مقابلے کے فنون سکھائیں۔

لڑکے کو کسی جائز باعزت پیشے اور لڑکی کو امور خانہ داری کی ٹریننگ دیں۔

بالغ ہونے پر شادی میں جلدی کریں۔

بچے کیوں بگڑتے ہیں:

بگڑے ہوئے بچوں کا تجزیہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں بگاڑ کی ابتدا عموما مندرجہ ذیل اسباب میں سے کسی ایک یا چند کہ وجہ سے ہوتی ہے۔

(۱) والدین یا بڑوں کا غلط نمونہ: بچے عموما اپنے ماحول ہی کی پیداوار ہوتے ہیں اپنے گردوپیش لوگوں کو جو کرتے دیکھتے ہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں کی تقلید کرتے ہیں۔

(۲) والدین یا بڑوں کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری: والدین یا گھر کے دوسرے افراد کے باہمی تعلقات کی ناخوش گواری بھی بگاڑ کا موجب ہوتی ہے، روز کی تو تو میں میں ،اور شکوہ شکایت اچھے بھلے گھر کو جہنم بنا دیتی ہے، جو بچے ایسے گھروں میں پلتے ہیں وہ طرح طرح کے اخلاقی اور ذہنی امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ایسے مدارس بھی جہاں اساتذہ کے باہمی تعلقات خوشگوار نہ ہوں بچوں کے بگاڑ کا اڈہ بن جاتے ہیں۔

(۳) ناروا سلوک: یہ ناروا سلوک خواہ والدین کی طرف سے ہو یا اساتذہ کی طرف سے، بہن بھائیوں کی طرف سے ہوں، یا درجے کے ساتھیوں اور ہم جولیوں کی طرف سے مثلا نفرت، تحقیر، تمسخر، بار بار کی مار پیٹ یا ڈانٹ پھٹکار، شک وسوء ظنی، اصلاح کی طرف سے مایوسی اور دوسروں سے شکایتیں کرتے پھرنا وغیرہ۔

(۴) احساس کمتری خواہ ذہنی وجسمانی کم زوری یا نقص کے باعث ہو یا اخلاق کی گراوٹ کی وجہ سے: بعض کوتاہیوں، کم زوریوں یا جسمانی نقائص کی وجہ سے جب بچے کو چڑایا جاتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہوکر بگڑنے لگتا ہے۔

(۵) بری صحبت: برے اور بگڑے ہوئے بچوں کی صحبت میں پڑکر اکثر شریف والدین کے بچے بھی بگڑ جاتے ہیں۔

(۶) ہم جولیوں کی صحبت سے محرومی: جہاں بری صحبت بچوں کو بگاڑ دیتی ہے وہیں اپنے ہم عمر بچوں کی صحبت سے محرومی بھی بگاڑ اور خرابیوں کا موجب ہوتی ہے بچے بہت سی باتیں کھیل میں اپنے ہم جولیوں سے سیکھتے ہیں، متوازن شخصیت پروان چڑھانے کے لیے اچھے ہم جولیوں کی صحبت بھی نہایت ضروری ہے۔

(۷) محبت وشفقت اور جائز ناز برداری سے محرومی: بھی بگاڑ کا موجب بنتی ہے۔

(۸) غیر معمولی لاڈ وپیار: یہ بھی بگاڑ کا بہت بڑا سبب ہے۔

(۹) دن بدن بڑھتی ہوئی فحاشی، بے حیائی اور فیشن پرستی: کتنوں کو بگاڑ دیتی ہے۔

(۱۰) سنسنی خیز فلمیں جاسوسی ناول، عریاں تصاویر اور فحش لٹریچر۔

ان وجوہ اسباب سے ہمارے نونہال جو طفل معصوم کے پیارے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور بلاشبہ جو ہماری گود میں معصوم ہی دئے جاتے ہیں، بلوغ سے پہلے ہی بعض ایسے ناپسندیدہ عادات واطوار بلکہ جرائم کا شکار ہوجاتے ہیں جنہیں سن کر شرم سے گردنیں جھک جاتی ہیں، آج وہ کون سے جرائم ہیں جو نوعمروں میں نہیں پائے جاتے، والدین کی فرماں برداری اور اساتذہ کا ادب واحترام، تقریبا اٹھ چکا ہے، ذوق سلیم اور جذبات لطیف کی کونپلیں مشکل ہی سے پھوٹتی ہیں، رحم دلی وہمدردی کے جذبات سے ان کے دل ودماغ یکسر محروم ہورہے ہیں، وسیع القلبی، ضبط نفس اور رواداری کا کوسوں پتا نہیں چلتا۔

علاج:

بگاڑ کا علاج عام طور پر یا تو سزا سے کرتے ہیں یا کڑی نگرانی کرکے ترک استعمال سے، بلاشبہ یہ دونوں حربے بھی بسا اوقات کارگر ثابت ہوتے ہیں بچے کو ایک ناشائستہ حرکت کے نتیجے میں جب دردناک سزا بھگتنی پڑتی ہے تو وہ درد اور تکلیف کے تلخ تجربات کی وجہ سے باز آجاتا ہے، اسی طرح جب کسی لغو حرکت کے اعادے کا زیادہ دنوں تک موقع نہیں ملتا تو اس کی طرف میلان کم زور پڑجاتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کی سزا کی وجہ

سے بچہ اور زیادہ جری اور بے باک ہوجاتا ہے اور بری عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں، اسی طرح بغیر اندرونی آمادگی کے جب ایک حرکت سے بچہ جبراً روک دیا جاتا ہے تو موقع ملتے ہی وہ اور زیادہ کھیل کھیلتا ہے اس لیے ان دونوں علاجوں پر بہت زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، ہر بچہ کے بگاڑ کی نوعیت اور اسباب جدا جدا ہوتے ہیں اس لیے سب کا علاج بھی ایک ہی نسخہ سے نہیں کیا جاسکتا، سب سے پہلے بگاڑ کے بنیادی اسباب کا پتا لگایا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ اصل سبب دور ہو جب تک جڑ موجود رہے گی ہوسکتا ہے بگاڑ کی نوعیت بدل جائے لیکن پورے طور پر اصلاح نہ ہوسکے گی، ذیل میں چند مزید تدابیر کی نشان دہی کی جاتی ہے ہر قسم کے بگاڑ میں یہ تدابیر مؤثر ہوسکتی ہیں پہلے انہیں آزمائیے۔

(۱) بچے کی کوتاہیوں کے باعث آپ کے رویے میں جو تبدیلی آگئی ہے اس کی اصلاح کیجئے وہ آپ کی محبت کا بھوکا ہے اس سے غیر مشروط محبت کیجئے اس کی ذات سے نہ کہ صفات سے اور اپنے قول وفعل اور سلوک وبرتاؤ سے اپنی محبت وشفقت کا یقین دلائیے سینکڑوں کوتاہیوں کا یہی مجرب علاج ہے۔

(۲) بحالت مجبوری ماحول بدل کر ایسی جگہ رکھیے جہاں لوگ اس کے عیوب سے واقف نہ ہوں اور اس کی شخصیت کا احترام کریں امید ہے کہ اس طرح وہ نئے ماحول میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلے گا اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش میں کوتاہیوں سے بچے گا۔

(۳) دلچسپی، عمر اور صلاحیت کے مطابق تعمیری مشاغل اور ذمہ داریوں میں حصہ لینے کے مواقع دیجئے۔

(۴) کوتاہیوں پر تنہائی میں دلسوزی سے سمجھائیے دوسروں کے سامنے ٹوکنے اور سزا دینے سے گریز کیجئے، ہمدردی اور محبت کے ساتھ کوتاہیوں پر قابو پانے کی عملی تدابیر بتائے۔

(۵) بچے کو اپنے اعتماد میں لیجئے اور اس پر بھی اعتماد کا اظہار کیجئے۔

(۶) اپنے برتاؤ میں استواری پیدا کیجئے تاکہ بچہ آپ کے مزاج کو بہ خوبی سمجھ سکے اور آپ کی خوشی کا لحاظ رکھ سکے۔

(۷) دلچسپ اور سبق آموز کہانیوں، واقعات وغیرہ کی مدد سے اچھائیوں سے لگاؤ اور

برائیوں سے نفرت پیدا کرائیے۔

(۸) اس کے احساسات اور نقطہ نظر کو بھی اہمیت دیجیے اس کی انفرادیت کو تسلیم کیجیے اور اس کی شخصیت کا واجبی احترام ملحوظ رکھیے۔

(۹) کھیل اور اچھے ہم جولیوں سے ملنے جلنے کے مواقع دیجیے۔

(۱۰) بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کیجئے، عمر تجربے اور فہم کی کمی کا حتی الامکان الاؤنس دیجیے، بچے بہ ہر حال نادان اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں اور بہت سی حرکات بنیادی خواہشات اور جبلی تقاضوں سے مجبور ہوکر کرتے ہیں،

توجہ اور دلچسپی:

ذہن کی اس کیفیت کو توجہ کہتے ہیں جب اسے دوسری تمام چیزوں سے ہٹا کر کسی ایک چیز پر مرکوز کردیا جاتا ہے تاکہ اس ایک چیز کے بارے میں کافی معلومات حاصل کی جاسکیں۔

اساتذہ اپنے طلبہ سے عام طور پر ترجہ دینے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں ان کا یہ مطالبہ ہے بھی معقول کیوں کہ تعلیم وتربیت میں کسی پیش رفت کی اس وقت تک توقع ہی نہیں کی جاسکتی جب تک طلبہ لکھنے پڑھنے، استاذ کی بات غور سے سننے اور مفوضہ کاموں کو انجام دینے کی طرف ہمہ تن متوجہ نہ ہوں۔

(۱) بیداری اور شعوری کی حالت میں ذہن برابر کسی نہ کسی چیز کی طرف متوجہ رہتا ہے، کبھی گردوپیش کی اشیاء کی طرف، کبھی کسی کی باتوں یا حرکات کی طرف، کبھی خود اپنے ہی کاموں یا تصورات وخیالات کی طرف، جب ہم بظاہر خالی بیٹھے ہوتے ہیں اس وقت بھی خیالات وتصورات کی ایک دھارا برابر رواں دواں رہتی ہے، کبھی ایک بات ذہن میں آتی ہے کبھی دوسری۔

(۲) ذہن جب کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے وہ چیز ذہن کے مرکز میں آجاتی ہے، باقی چیزیں ذہن کے حاشیے میں پہنچ جاتی ہیں، ایک دفعہ میں توجہ ایک ہی چیز پر مرکوز ہوتی ہے، دوسری چیزیوں ہی مرکز توجہ بنتی ہے پہلی فوراً ہٹ کر حاشیے میں چلی جاتی

ہے شعور کی حالت میں یہی عمل جاری رہتا ہے۔

(۳) ایک ہی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز نہیں رہ سکتی، منٹ میں عموماً چار پانچ بار توجہ بھٹکتی ہے چھوٹے بچے تو پانچ سات سیکنڈ سے زیادہ کسی ایک چیز پر توجہ مرتکز کر ہی نہیں سکتے، الا یہ کہ اس چیز کے مختلف پہلو باری باری سامنے لائے جائیں، ایسی صورت میں کچھ دیر تک توجہ مرکوز ہو سکتی ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو چند ہی سیکنڈ میں توجہ کسی اور طرف چلی جائے گی، نماز میں برابر متوجہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کے مفہوم اور تقاضوں پر ہی ساتھ ہی ساتھ غور کیا جائے ورنہ معلوم نہیں کیا کیا خیالات آنے لگتے ہیں۔

(۴) ایک فرد کی ایک دفعہ ایک ہی چیز پر توجہ ہو سکتی ہے، جو لوگ بیک وقت کئی باتوں پر توجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں اس طرح وہ یکسوئی کے ساتھ ایک چیز کی طرف بھی توجہ نہیں دے سکتے، کئی چیزوں پر بیک وقت اس صورت میں توجہ دی جا سکتی ہے جب وہ سب مل کر ایک ایسے کلے میں تبدیل ہو جائیں جس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جا سکے ،مثلاً تاروں کے جھرمٹ عقد ثریا اور دب اکبر وغیرہ یا انسانی جسم جو مختلف اعضاء سے مل کر بنتا ہے یا کوئی منظر جو متعدد اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے بحیثیت مجموعی ایک نظر میں یہ چیزیں توجہ کا مرکوز ہوں گی باقی اجزا مرکز سے پرے ہٹ جائیں گے۔

(۵) بعض بچے لکھتے پڑھتے یا آموختہ دیکھتے وقت کچھ کھاتے بھی جاتے ہیں یا ادھر ادھر دیکھتے یا تعلیمی سامان کو بلاضرورت چھوتے یا اس سے کھیلتے رہتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں اس طرح توجہ مرکوز نہیں رہ سکتی بلکہ بھٹک کر دوسری طرف چلی جاتی ہے ان حرکات سے بچوں کو روکنا چاہیے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔

توجہ کے شرائط:

اساتذہ اور والدین کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ بچے لکھنے پڑھنے یا کسی سنجیدہ کام کو انجام دینے کی خاطر توجہ نہیں دیتے، عموماً کھیلنے کودنے، آوارہ گردی کرنے، ہم جولیوں سے خوش گپیاں کرنے یا کچھ بنانے بگاڑنے ہی میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں، تعلیم کے بجائے ان کی توجہ دوسری لغو اور لایعنی چیزوں کی طرف ہوتی ہے، ان کی

شکایت ہے تو دراصل حقیقت پر مبنی لیکن اس میں تنہا بچوں کا قصور نہیں بلکہ وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں کیوں کہ ان کی طرف سے دراصل وہ شرطیں پوری نہیں کی جاتیں جو بچوں کو لکھنے پڑھنے یا کسی مناسب کام پر توجہ دینے کے لیے ضروری ہیں۔

کسی طرف توجہ مبذول ہونے کی متعدد شرطیں ہیں ان میں سے کچھ کچھ خارجی ہیں اور کچھ داخلی ہیں۔

خارجی شرطیں

خارجی شرطیں حسب ذیل ہیں:

(۱) شدت: جو چیز شدت میں جتنی زیادہ اور سائز میں جتنی بڑی ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہے، مثلاً شوخ رنگ، تیز روشنی، بلند آواز، حسین صورت، بڑا پوسٹر وغیرہ اس کے برعکس سائز میں چھوٹی یا شدت میں معمولی چیزیں نظر انداز ہو جاتی ہیں اس لیے تختہ سیاہ پر اسکیچ بڑا اور خط جلی ہونا چاہیے، چھوٹے بچوں کے سامنے پیش کیجانے والی تصاویر میں رنگ شوخ ہونا چاہیے اور حتی الامکان چاک بھی رنگین ہی استعمال کرنی چاہیے، طلبہ کے سامنے بہت دھیمی آواز میں چیخنا چلانا مختلف وجوہ سے درست نہیں۔

(۲) تکرار یا اعادہ: کسی لفظ، فقرے یا جملے کی تکرار مثلاً دوڑو دوڑو! سانپ! سانپ! چور! چور! ہلاک ہوا وہ! ہلاک ہوا وہ! وغیرہ توجہ کو کھینچ لیتے ہیں ایسی کہانیاں بچے بڑے غور سے سنتے ہیں جن میں ایک شگفتہ جملہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دہرا دیا جاتا ہے، اسی طرح کسی اشتہار کا متعدد بار سامنے آنا بھی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔

(۳) حرکت یا تبدیلی: حرکت کرنے، پھیلنے، بڑھنے یا برابر روپ بدلنے والی چیزیں بھی توجہ کو بآسانی کھینچ لیتی ہیں اور دیر تک متوجہ رکھتی ہیں، سائن بورڈوں پر لگے ہوئے بلب جو جلتے بجھتے رہتے ہیں اسی غرض سے لگائے جاتے ہیں کہ لوگ بآسانی ادھر متوجہ ہوں، آوازوں میں اتار چڑھاؤ بھی توجہ کو مرکوز رکھتا ہے چلتے چلتے کسی کا پھسل کر گر جانا، جلتی ہوئی بتی کا اچانک بجھ جانا، روشنی کا مدہم ہونے لگنا یا چلتے چلتے پنکھے کا رک جانا، عام حالات میں ان پر توجہ نہیں ہوتی، لیکن جوں ہی ان میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو فوراً اس کی طرف

منعطف ہوجاتی ہے۔

(۴) جذبات یا نیا پن: کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو فوراً توجہ کو کھینچ لیتی ہے، کوئی مانوس چیز بھی خلاف توقع اگر ہیئت بدل کر یا کسی غیر معمولی حالت میں سامنے آتی ہے تو جاذب توجہ بن جاتی ہے، مثلاً کسی ساتھی کا عجیب وغریب لباس میں آنا، البتہ کسی نئی چیز کا بالکل نامانوس ہونا ٹھیک نہیں، سابقہ معلومات سے ہر نئی چیز کا کچھ ربط ہونا چاہیے خواہ یہ تعلق مماثلت کے بجائے تضاد ہی کا کیوں نہ ہو ورنہ نظر انداز ہوجائے گی یا بچے اس سے وحشت محسوس کریں گے۔

(۵) واضح اور قابل فہم ہونا: وہ چیزیں نسبتاً جاذب توجہ ہوتی ہیں جو صاف ستھری، خوب صورت اور واضح ہوں، نیز آسانی سے سمجھ میں آجائیں، مبہم یا غیر واضح اشیاء پر کم ہی توجہ جاتی ہے۔

(۶) موازنہ ومقابلہ: دو متضاد چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا جائے تو جاذب توجہ بن جاتی ہیں دو متضاد رنگوں میں بنی ہوئی تصویریں یا چارٹس، دو مقامات کی پیداوار، دو افراد کی آمدنیاں، دو ممالک کی شرح اموات وغیرہ جن میں نمایاں فرق ہو اگر ساتھ ساتھ پیش کی جائیں تو توجہ کو زیادہ آسانی سے کھینچ لیتی ہیں۔

داخلی شرطیں

(۱) دلچسپی: ہم عموماً صرف ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں جن سے ہمیں فطری دلچسپی یا طبعی مناسبت ہوتی ہے، ایک بچہ کھانے کھیلنے کی طرف بآسانی متوجہ ہوگا جب کہ ایک محقق قلمی مسودات اور کرم خوردہ مخطوطات کی طرف۔

(۲) عادت: تربیت کے ذریعے جس چیز پر توجہ دینے کی عادت ڈلوائی جائے گی، رفتہ رفتہ اس طرف توجہ ہونے لگے گی خواہ وہ چیز بذات خود بہت زیادہ جاذب توجہ نہ ہو، ایک، تار بابو تار کی آواز پر، قاری کسی کی قرأت پر اور طبیب نسخوں کی طرف بآسانی متوجہ ہوجاتا ہے، کیوں کہ ان پر توجہ دینے کی انہیں عادت ہوگئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف محکموں میں کام کرنے والے لوگ جب گھروں پر بھی آپس میں ملتے ہیں تو اپنے محکمے ہی کی باتیں کرتے

رہتے ہیں حالاں کہ محکمہ جاتی کام عموماً خشک ہی ہوتے ہیں۔

(۳) فطری داعیات اور حیاتیاتی ضروریات: وہ چیزیں بآسانی بچوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں جن سے ان کی کوئی فطری خواہش یا حیاتیاتی ضروریات پوری ہو، مثلاً کھانے پینے یا کھیلنے کودنے کی چیزیں وغیرہ۔

(۴) مزاج اور موڈ: توجہ پر مزاج اور موڈ کا بھی اثر پڑتا ہے، بعض لوگ اپنے مزاج ہی کی وجہ سے اپنے تصورات ہی میں مگن اور اپنے خیالات میں گم رہتے ہیں تو بعض بیرونی دنیا اور گردوپیش میں زیادہ دلچسپی لیتے اور ان پر توجہ دیتے ہیں، اسی طرح جب خفگی کا موڈ طاری ہوتا ہے تو گردوپیش کی معمولی بے اعتدالی بھی متوجہ کرلیتی اور غصے کو مزید بھڑکا دیتی ہیں جب خوش وخرم ہونے کی صورت میں اس طرح کی معمولی کوتاہیوں کی طرف سے صرف نظر کرلیتے ہیں اور ان پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتے۔

(۵) دماغی قوت: تازہ دم اور ہشاش بشاش ہونے کی صورت میں کسی چیز کی طرف دیر تک توجہ مرکوز رہ سکتی ہے لیکن رنج یا صدمے کی صورت میں بیرونی کی بجائے اندرونی چیزوں پر توجہ ہوتی ہے، تکان کی صورت میں توجہ بار بار بھٹکتی ہے اور ذہن کسی ایک چیز پر مرکوز نہیں ہوتا۔

توجہ کی قسمیں: توجہ کی مختلف قسمیں ہیں:

(۱) ارادی اور غیر ارادی توجہ:

جب کسی چیز پر اس لیے توجہ دیجاتی ہے کہ وہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے تو اسے ارادی توجہ کہتے ہیں مثلاً امتحان پاس کرنے، طلبہ میں نمایاں ہونے، اساتذہ کی خوشنودی حاصل کرنے یا والدین کی نظروں میں محبوب بننے کے لئے تعلیم یا کسی اور کام پر توجہ دینا۔

جب کوئی چیز بذات خود جاذب توجہ ہو اور اس کی طرف توجہ دینے کے لیے کسی ارادے کی ضرورت پیش نہ آئے تو اسے غیر ارادی توجہ کہتے ہیں مثلاً تیز آواز، شوخ رنگ، شوروغل، ڈگڈگی کی آواز، چلتی ہوئی ٹرین، اڑتے ہوئے جہاز، گذرتے ہوئے جلوس

وغیرہ کی طرف توجہ دینا۔

(۲) مرتکز اور منقسم توجہ:

بعض افراد فطرتاً گہری توجہ کے مالک ہوتے ہیں اور کسی ایک ہی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز رکھ سکتے ہیں، بعض کی توجہ منقسم ہوتی ہے، وہ تھوڑی تھوڑی دیر بدل بدل کر مختلف چیزوں کی طرف ایک ساتھ توجہ کر سکتے ہیں، علمی کام کرنے کے لئے گہری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور عملی کام یا انتظامی امور کے لئے منقسم توجہ کی، لڑکیاں منقسم توجہ کی مالک ہوتی ہیں اس لیے ریاضی میں وہ کم زور رہتی ہیں کیوں کہ یہ مضمون گہری توجہ چاہتا ہے۔

(۳) ڈانواڈول اور پائیدار توجہ:

چھوٹے بچوں کی توجہ بار بار بھٹکتی ہے، وہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر تک توجہ نہیں دے سکتے جب کہ بڑوں کی توجہ نسبتاً پائیدار ہوتی ہے اور وہ دیر تک ایک ہی طرف متوجہ رہ سکتے ہیں، علالت یا تکان کی وجہ سے بھی توجہ جلد جلد بھٹکتی ہے۔

توجہ اور دلچسپی:

توجہ اور دلچسپی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ہر فرد عموماً ان چیزوں کی طرف توجہ دیتا ہے جو اس کے لیے دلچسپ ہوتی ہیں۔

بچوں کہ بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ:

(۱) محنت مشقت سے جی چراتے ہیں اور جم کر کوئی کام کرنا نہیں چاہتے۔

(۲) چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے اور سیر وتفریح یا کھیل کود کے منصوبے بنایا کرتے ہیں۔

(۳) آزاد منش ہوتے ہیں، کسی کا دباؤ اور تسلط پسند نہیں کرتے اور نہ کوئی پابندی گوارہ کرتے ہیں۔

(۴) توجہ اور انہماک سے گھبراتے اور کوسوں دور بھاگتے ہیں۔

(۵) توڑ پھوڑ، شور شغب، ہنگامہ آرائی اور کھیل کود کے رسیا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی مخلوق کو لکھنے پڑھنے یا کسی سنجیدہ کام پر لگانا آسان نہیں ہے بچے ان چیزوں پر اسی صورت

میں توجہ دیں گے جب یہ کام ان کے لیے دلچسپ بنا دیے جائیں۔ اسباق کو دلچسپ بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر کارگر ثابت ہو سکتی ہیں

(۱) سب سے پہلے سبق کی غرض وغایت بچوں کے ذہن میں بہ خوبی بٹھا دی جائے یہاں تک کہ وہ اپنے طور پر اس کی ضرورت وافادیت محسوس کر لیں۔

(۲) سبق اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اس سے بچے کی اپنی کوئی بنیادی خواہش، فطری داعیہ، جبلی تقاضہ یا ذاتی غرض پوری ہوتی ہو، مثلاً کھیل کھیل میں تعلیم دی جائے یا تجسس کو ابھار کر اس کی تسکین کا سامان کیا جائے، کچھ تعمیری کام اور بنانے بگاڑنے کا موقع دیا جائے، ہم جولیوں کی قدر دانی، بڑوں کی ہمت افزائی، اساتذہ کی خوشنودی وغیرہ کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے وغیرہ۔

(۳) اگر ممکن ہو تو سبق کا مواد کہانی یا مکالمے کی شکل میں پیش کیا جائے۔

(۴) اصولی باتوں اور مجرد تصورات کو ٹھوس، نقشہ جات، تصاویر ماڈل رنگین چاک کے اسکیچ وغیرہ سے سبق کو واضح کیا جائے۔

(۵) بچوں کی شخصیت اور ان کی کوششوں کو اہمیت دی جائے سبق کو آگے بڑھانے میں ان سے مدد لی جائے ان سے مشورہ مانگے جائیں، البتہ ناکامی کے مواقع نہ آنے پائیں۔

(۶) کسی حد تک مقابلے ومسابقت کے مواقع دیے جائیں۔

(۷) بچوں کو اپنی کوششوں کے مفید نتائج اپنی نظروں سے سیکھ لینے کا بندوبست کیا جائے۔

(۸) کوششوں میں کامیابی پر دل کھول کر سراہا جائے اور شاباشی دی جائے۔

(۹) سبق کو اس کی روزمرہ کی زندگی سے مربوط کر دیا جائے اور اس سے متعلق گھر کے لیے کوئی ایسا کام دیا جائے جس سے اس کی کسی جبلت کی تسکین ہوتی ہو۔

(۱۰) سویرے جب بچے مدرسے آتے ہیں تو ان کی توجہ بھٹکتی رہتی ہے اس لیے پہلے گھنٹے میں کوئی آسان یا فطری دلچسپی کا مضمون رکھا جائے۔

(۱۱) تھوڑی دیر کے بعد بچوں کی توجہ بہت تیزی سے بڑھتی ہے اور دوسرے تیسرے گھنٹے میں اپنے شباب پر پہنچ جاتے ہیں ان گھنٹوں میں توجہ طلب اہم اور مشکل مضامین رکھے جائیں مثلاً حساب عربی اور مادری زبان وغیرہ۔

(۱۲) چھوٹے بچوں کی توجہ جلد جلد بھٹکتی ہے وہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر تک توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے اس لیے ان کے گھنٹے مختصر رکھے جائیں اور دیر تک توجہ مرکوز کرنے کا عادی بنانے کے لیے پہلو بدل بدل کر اور ندرت کی کچھ چاشنی شامل کر کے چیزوں کو پیش کیا جائے تا کہ وہ کچھ دیر تک متوجہ رہ سکیں۔

(۱۲) بچوں کو متوجہ کرنے اور سبق میں ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مدرس خود اپنے کام کی طرف غیر معمولی توجہ دے اور سبق میں پوری توجہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کرے۔

(۱۳) سبق کے مختلف اجزا کو اس انداز سے ترتیب دے کر اور باہم مربوط کر کے پیش کیا جائے کہ ایک جز دوسرے کا تتمہ معلوم ہو اور فطری طور پر اگلے جز کی طرف منتقل ہو جائے ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک جز ختم نہ ہونے پر ساتھ ہی توجہ بھی ختم ہو جائے۔

(۱۴) اسی طرح مختلف مضامین کو بھی باہم اسطرح مربوط کر کے پڑھایا جائے کہ ایک مضمون سے فطری طور پر ذہن دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہو جائے تا کہ ایک مضمون ختم ہونے پر توجہ بھٹکنے نہ پائے۔

(۱۵) ہر نئی بات سابقہ معلومات سے مربوط کر کے پیش کی جائے تا کہ سبق بچوں کے لیے بالکل نامانوس یا قابل فہم نہ رہے۔

(۱۶) ابتدائی درجات کے بچے صرف ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں جن میں فطری دلچسپی ہوتی ہے یا جو توجہ کو بے ساختہ کھینچ لیتی ہیں، مثلاً کھیل آرٹ و کرافٹ کے کام، شوخ رنگ، تیز آواز، متحرک اور پھیلنے والی اشیاء وغیرہ، ان چیزوں کے ذریعے اگر تعلیم دی جائے تو ان کی توجہ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، مثلاً کھیل کھیل میں تعلیم دینا لیکن بتدریج بچوں کو ارادی توجہ کا عادی بنانا چاہیے کیوں کہ زندگی میں انسان کو بیشتر ایسے کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے جو بذات خود دلچسپ نہیں ہوتے تا کہ بچے ان کاموں پر توجہ دینے لگیں جو بہ ہر حال ان کے لیے بہت مفید اور نہایت ضروری ہوتے ہیں لیکن ان میں فطری دلچسپی نہیں ہوتی۔

(۱۷) تدریس کا کام پرسکون ماحول اور اچھی فضا میں انجام دیں تا کہ طلبہ بآسانی متوجہ ہوں اور توجہ ہٹانے والی اشیاء کو قریب نہ بھٹکنے دیں، غیر متعلق تصاویر اور چارٹس سامنے سے

ہٹا دیں۔

(۱۸) بچوں کو متوجہ کرنے کے لیے بار بار ڈرانا، دھمکانا، میز پر ہاتھ مارنا، چگڑی رکھنا، چیخنا چلانا مناسب نہیں ایسا کرنے سے تھوڑی دیر کے لیے بچے متوجہ تو ہو جاتے ہیں لیکن ایسی توجہ میں پائیداری نہیں ہوتی، ساتھ ہی ان چیزوں کا زیادہ استعمال بعض ایسے جذبات پیدا کر دیتا ہے جو اصل چیز کی طرف توجہ دینے میں مانع ہوتے ہیں، کچھ دنوں کے بعد اس طرح کی کوششیں غیر مؤثر اور بے سود ثابت ہوتی ہیں۔

(۱۹) درجے پر برابر نظر رکھنی چاہئے، تختہ سیاہ پر لکھتے وقت بھی درجے کی پیٹھ نہ کرنی چاہیے بلکہ ایک جانب سے لکھنا اور بار بار درجے کی طرف دیکھتے رہنا چاہیے، غیر متوجہ طلبہ سے اچانک سوال کر لینا چاہیے، اس طرح سبق کی طرف درجے کی توجہ برقرار رہے گی۔

(۲۰) بچوں کی توجہ کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے وقت واحد میں چند ہی اشیاء سما سکتی ہیں اس لیے پڑھاتے وقت مختصر جملے استعمال کرنے چاہیں، بہت ٹھہر ٹھہر کر بولنا چاہیے، املا لکھاتے وقت ایک دفعہ میں بہت مختصر فقرہ بولنا چاہیے۔

سیکھنا:

تعلیم و تربیت کا پورا نظام ہی دراصل سیکھنے اور سکھانے کی لیے قائم کیا جاتا ہے مدرسے نادان اور ناواقف بچوں کو ایک تدریج سے وہ باتیں سکھانے کے لیے کھولے جاتے ہیں جو وہ نہیں جانتے یا جو انہیں بہ ہر حال جاننا چاہئے مثلاً لکھنا پڑھنا، مختلف علوم و فنون میں مہارت، پسندیدہ عادات و اطوار، مختلف موقع کے آداب اور لوگوں کے ساتھ مناسب برتاؤ وغیرہ، سیکھنے کا یہ کام پیدائش سے لیکر موت تک برابر جاری رہتا ہے۔

سیکھنے کا کام عموماً مندرجہ ذیل طریقوں سے انجام پاتا ہے۔

خود کر کے سیکھنا:

بچے طبعاً بہت چلبلے ہوتے ہیں، ان کے ہاتھ پیر برابر چلتے رہتے ہیں، جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتے، کچھ بناتے اور کچھ بگاڑتے نظر آتے ہیں، اپنی ان حرکات و سکنات کے دوران وہ متعدد تجربات سے دوچار ہوتے ہیں، جن میں بعض تلخ اور بعض خوشگوار

ہوتے ہیں، کبھی نشانہ ٹھیک بنتا ہے، کبھی چوک جاتا ہے، اس طرح وہ تجربات کے ذریعے متعدد باتیں سیکھتے ہیں۔

تربیت سے سیکھنا:

والدین، اساتذہ اور دوسرے متعلقین بچوں کی تربیت کو اپنا اہم فریضہ سمجھتے ہیں وہ انہیں پیار محبت یا سختی نرمی سے کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے ہیں، کوئی غلط کام کرتے دیکھتے ہیں تو روک ٹوک کر کے اصلاح کر دیتے اور صحیح طریقہ بتا دیتے ہیں چنانچہ متعدد باتیں بچے تربیت کے طفیل سیکھتے ہیں۔

مشاہدہ اور تقلید سے سیکھنا:

ہر فرد کی معلومات کا سب سے اہم ذریعہ اس کی آنکھیں ہیں، وہ جو کچھ جانتا ہے اس کا ۵/۴ حصہ عموماً آنکھوں ہی کے ذریعے حاصل کیا ہوتا ہے، اس کی آنکھیں ہر وقت اسے متعدد باتوں کا مشاہدہ کراتی اور ان کے متعلق معلومات فراہم کرتی رہتی ہیں، بہت سی باتیں بچے دوسروں کے دیکھا دیکھی اور ان کی نقل میں کرنے لگتے ہیں، غرض مشاہدہ اور تقلید بھی نہایت اہم ذرائع ہیں۔

سوجھ بوجھ سے سیکھنا:

ہر بچے کو مختلف قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کبھی گیند لڑھک کر نالی میں چلی جاتی ہے اسے نکالنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے، پتنگ کی ڈوری کسی چیز میں پھنس جاتی ہے، اسے چھڑانے کا سوال ہوتا ہے، کبھی کھانے پینے کی چیز دسترس سے باہر ہوتی ہے اسے حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے، کبھی استاذ کی خفگی سے بچنے اور کبھی والدین کی خوشنودی حاصل کرنے کا سوال درپیش ہوتا ہے وغیرہ، غرض طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان سے نمٹنے اور عہدہ برآ ہونے کے لیے بچوں کو سوجھ بوجھ اور غور و فکر نیز غیر معمولی جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے، مختلف حل سامنے آتے ہیں وہ انہیں آزماتے ہیں اور اپنی کوششوں میں اکثر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں، اس طرح متعدد باتیں وہ سوجھ بوجھ سے سیکھ لیتے ہیں۔

مشروط اضطرار سے سیکھنا:

اپنے جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کی تکمیل کے دوران بچوں کو متعدد تجربات ہوتے ہیں، یہی تجربات بچوں کو کسی کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرنے میں امداد بہم پہنچاتے ہیں، مثلاً والدین اور بہن بھائیوں سے محبت، اساتذہ کا احترام، مضامین سے لگاؤ، مشاغل میں دلچسپی، اندھیرے اور موذی جانوروں کا خوف وغیرہ۔

یہ ہیں مختلف طریقے اور ذریعے جو سیکھنے کے عمل میں معاون ہوتے ہیں۔

سیکھنے کے قوانین

سیکھنے کے تین بنیادی قوانین ہیں:

(۱) قانون آمادگی (۲) قانون تاثیر (۳) قانون مشق

ان قوانین کی پابندی سے ہی بچوں کو کچھ سکھایا جاتا ہے۔

(۱) **قانون آمادگی** : سیکھنے کا کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب سیکھنے والا اس کے لیے آمادہ ہو، آمادگی کے بغیر کچھ نہیں سیکھا جا سکتا کیوں کہ ایسی صورت میں وہ اس کے لیے کوشش ہی نہیں کرے گا اسی لیے سبق پڑھانے یا کچھ سکھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لیے پوری طرح تیار اور آمادہ کر لینے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، سزا کے خوف یا خارجی دباؤ اور جبر و تشدد کے تحت جو کام لیا جاتا ہے اس میں بچے کی پوری آمادگی شامل نہیں ہوتی اسی لیے بہت کم نتیجہ خیز ہوتا ہے، اس کے برعکس اگر بچے کی فطری خواہشات اور اس کی دلچسپیوں کا لحاظ کر کے، نیز کام کی ضرورت و افادیت بخوبی ذہن نشین کرا کے کام لیا جاتا ہے تو وہ پوری آمادگی سے کام کرتا ہے اور اس کے انجام دینے میں اپنی پوری طاقت جھونک دیتا ہے، چناں چہ ایسا کام نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

(۲) **قانون تاثیر**: کوئی کام اس وقت دلچسپی اور انہماک سے کیا جاتا ہے جب اس سے خوش گوار نتائج برآمد ہوں اگر کسی کام کے کرنے سے راحت کے بجائے تکلیف پہنچے گی یا تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑے گا تو کوئی فرد اس کے پاس بھی نہیں بھٹکے گا، چہ جائے کہ

اس کو خوشی سے انجام دینا، بچے ابتدا میں نادانی سے بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن کے نتائج تکلیف دہ ہوتے ہیں، لیکن یہی تلخ تجربات سے آئندہ ان کاموں سے باز رکھتے ہیں، اس کے برعکس وہ ایسے کاموں کو بار بار کرتے ہیں جن سے انہیں سکون، مسرت اور راحت نصیب ہو، اسی اصول کی بنا پر ناپسندیدہ حرکات کے ساتھ تلخ تجربات اور پسندیدہ عادات واطوار کے ساتھ خوشگوار تجربات وابستہ کرنے کے لیے غلطیوں اور کوتاہیوں پر سزا دی جاتی ہے اور اچھے کاموں پر شاباشی اور انعام۔

(۳) **قانون مشق** : کسی کام کو بار بار کرنے سے اس میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بآسانی انجام پانے لگتا ہے، اگر کچھ عرصہ چھوڑ دیا جائے تو مہارت گھٹ جاتی ہے، کچھ سکھانے اور کام میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مشق کے کافی مواقع ملیں، اسی اصول کی بنا پر کوئی قاعدہ سکھانے اور بہ خوبی ذہن نشین کرانے، کوئی طریقہ سلیقہ بتانے یا پسندیدہ عادات واطوار مستحکم کرانے کے لیے بار بار مشق کرائی جاتی ہے اور بری عادات واطوار ترک کرانے کے لیے ان کے بروئے کار آنے کے مواقع سے محروم کر دیا جاتا ہے اور پوری نگرانی کی جاتی ہے کہ اس کے عمل میں آنے کی نوبت ہی نہ آنے پائے، سگریٹ نوشی یا چوری وغیرہ چھڑانے کے لیے عموماً ترک استعمال ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔

سیکھنے میں مہارت

سیکھنے میں مہارت کا انحصار متعدد امور پر ہے:

(۱) سیکھنے کا مصمم ارادہ:

مہارت حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم شرط سیکھنے والے کا اپنا عزم راسخ ہے، جب تک سیکھنے والا کسی کام کے سیکھنے کا خود مصمم ارادہ نہ کرے وہ قطعاً کچھ نہیں سیکھ سکتا، سکھانے والا خواہ کتنا ماہر ہو اور سکھانے کے لیے لاکھ سر مارے مگر سیکھنے والے کی آمادگی اور ارادے کے بغیر وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا، مصمم ارادہ کے لیے زوردار تحریک ہونی چاہیے، کام کی افادیت واہمیت بہ خوبی ذہن نشین ہونی چاہیے، نیز اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ اس کام کو سیکھ سکتا ہے۔

(۲) سیکھنے کے لیے اقدام:

محض ارادے سے کچھ نہیں بنتا، سیکھنا ہے تو اس کے لیے عملی جدوجہد کرنی ہوگی، ہاتھ پیر مارے بغیر سیکھا نہیں جا سکتا، خود کرنے ہی سے فن آتا ہے، مثلاً تیراکی کا فن ہے، سکھانے والا خواہ زبردست تیراک ہو اور پوری دلچسپی اور مہارت فن کے ساتھ نظری طور پر تیرنے کے طریقے بتاتا یا عملاً کر کے دکھاتا رہے، نیز خود سیکھنے والا پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا اور غور سے اس کی تیراکی کا مشاہدہ کرتا رہے پھر بھی جب تک خود دریا میں اتر کر ہاتھ پیر نہ مارے گا، تیرنا ہرگز نہیں سیکھ سکتا، اسی لیے مدارس میں علم کو عمل میں لانے اور خود کر کے سیکھنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کیوں کہ مجہول سامع بن کر کسی فن میں مہارت ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی۔

(۳) کام کی لیے موزوں حالات:

سیکھنے کے لیے حالات جتنے موافق اور سازگار ہوں گے، سیکھنے میں اتنی ہی سہولت اور آسانی ہوگی، اگر گردوپیش حالات پرسکون ہوں، فضا سازگار اور موسم موافق ہو، توجہ مرکوز کرنے اور یکسوئی کے ساتھ کام پر لگنے میں کوئی خاص امر مانع نہ ہو تو سیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، لیکن اگر توجہ کو بھٹکانے، بے زاری پیدا کرنے اور کام میں رکاوٹ ڈالنے والے عوامل موجود ہوں تو سیکھنے میں بڑی زحمت پیش آئے گی، بمشکل کچھ سیکھا جا سکے گا، اس لیے پرسکون ماحول اور سازگار فضا میں تعلیم دینے پر زور دیا جاتا ہے اور توجہ کو بھٹکانے والی اشیاء کو بچوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

(۴) سخت جدوجہد:

مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری توجہ انہماک اور جانفشانی سے کام کیا جائے، پوری کوشش، سخت محنت اور غیر معمولی جدوجہد کے بغیر مہارت حاصل نہیں ہوتی، مہارت اور چابک دستی کے ساتھ کام میں تیز رفتاری اور سرعت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے، اطمینان کے ساتھ کام کرنا تو بہ ہر حال ضروری ہے لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کاہلی اور سست رفتاری سے کام کیا جائے، ماہرفن عموماً سست رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں، ابتدا ہی سے اس طرف توجہ دی جائے تو مہارت کے ساتھ تیز رفتاری بھی بآسانی

پیدا ہوسکتی ہے۔

(۵) مدت کارکردگی

کارکردگی کی مدت نہ تو بہت طویل ہونی چاہیے کہ بچہ تھک کر چور چور ہو جائے اور نہ اتنی مختصر کہ کوئی خاص نتیجہ ہی برآمد نہ ہو سکے، بلکہ عمر اور صحت کا لحاظ کر کے مقرر کی جائے ،اگر تکان غالب آنے لگے تو کام روک کر آرام کا موقع ملنا چاہیے، غیر معمولی تکان اور خستگی کی حالت میں کام کرنا صحت کے لیے انتہائی مضر بھی ہوتا ہے اور بے سود بھی، نظام الاوقات میں تکان اور بے زاری کا اس لیے غیر معمولی لحاظ رکھا جاتا ہے۔

عزم محکم ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

مریں گے ہم کتابوں پر!

طلبہ کو دارالمطالعے (لائبریری) تک کیسے لایا جائے؟

دنیا کا سب سے اہم کام لکھنا اور پڑھنا ہے، جس نے اس مرحلے میں قابو پالیا اس نے گویا سارا عالم جیت لیا، پوری دنیا میں تعلیمی میدان میں کام کرنے والے افراد طلبہ کو دراصل کوئی نئی چیز یا بالکل آخری چیز نہیں پڑھا رہے ہیں بلکہ طلبہ کو صرف لکھنے پڑھنے پر آمادہ کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ میں وہ شاہ کلید دے رہے ہیں جس سے وہ مستقبل کے علمی خزانے کھول سکیں اور ان پر اپنی علمی سلطنت کی بنیاد قائم کر سکیں۔

دنیا کی آبادی کو یونیسکو کے تعلیمی مشیروں نے تین طبقوں میں بانٹا ہے۔

(۱) نوکری پیشہ افراد (۲) تجارت پیشہ افراد (۳) مدرسین

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسین نہ تو نوکر یا ملازم ہیں یا نہ ہی وہ تجارت کر رہے ہیں ،دنیا کی آبادی میں یہ ایک طبقہ سب سے جدا لیکن سب کی رگ جاں سے قریب تر ہے، اگر کوئی ماتحت کسی افسر کو کوئی تحفہ پیش کرتا ہے تو وہ رشوت میں شمار کیا جائیگا لیکن اگر کوئی طالب علم یا اس کا سرپرست کسی مدرس کو کوئی تحفہ پیش کرتا ہے تو وہ اس کی عقیدت اور شکریے کی ایک علامت گردانی جائے گی ،اگر آپ ہم سے پوچھیں گے کہ ڈاکٹر اور وکیل کیا ہیں تو ہم صاف صاف کہیں گے وہ بھی تاجر ہیں کیوں کی ان کی فیس بھی شہرت اور بازار بھاؤ کی طرح چڑھتی اور اترتی رہتی ہے، دنیا میں ان پیشوں کو بھی محترم گردانا گیا ہے البتہ ڈاکٹروں پر بعض پابندیاں بھی عائد کر دی گئی ہیں ورنہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اخبار میں اشتہارات دینے سے بھی نہیں چوکتے ،اس پابندی کے باوجود بعض چھوٹے قسم کے ڈاکٹروں کے اشتہارات اخباروں میں دیکھنے کو مل ہی جاتے ہیں، اب ہمارے ملک میں ایسے بہت کم ڈاکٹر یا وکیل رہ گئے ہیں جن کی وجہ سے ان پیشوں کی تقدیس قائم ہے، جیسا کہ ہم نے ابتداء میں عرض کیا کہ دنیا کا سب سے اہم کام پڑھنا لکھنا ہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لکھنا اور پڑھنا

سکھانا کتنا مشکل کام ہوگا، اس مشکل کے باوجود دنیا کی ایک بڑی آبادی اس مقدس پیشے سے منسلک ہے اور نکتہ ایماں کی تفسیریں بیان کرنے کے شعوری یا غیر شعوری عمل میں مصروف ہیں یہی عمل اکثر (افلاطونی تدریس) یا اتالیقیت کہلاتا ہے۔ کسی مدرس کا سب سے بڑا سہارا کتاب ہے، جب معلم یا مدرس آرام بھی کر رہا ہوتا ہے تو اس کے افکار کتابی صورت میں روشنی بکھیرتے رہتے ہیں اور جس مکان میں دنیا کے بہترین معلم کی قلمی کاوشیں کتابی صورت میں محفوظ کر دی جاتی ہیں وہی مکان لائبریری کہلاتا ہے، جس تعلیمی ادارے کے تمام راستے کتب خانے کی طرف نہیں مڑتے وہ ادارہ تعلیم گاہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے اور جن طلبہ واساتذہ کے قدم کتب خانوں کی طرف نہیں اٹھتے انہیں اپنے پیشے کو طلاق دے دینی چاہئے، یہ محض ایک جملہ معترضہ ہی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی تعلیمی مفروضہ بھی ہے، کتاب کے بغیر کبھی کبھار استاذ بھی ادھورا محسوس ہوتا ہے، لیکن جب طالب علم بغیر سہارے کے علمی میدان میں چل نکلتا ہے تو کتاب ہی اس کا سب سے بڑا رفیق اور سب سے بہترین سہارا ہے، کتاب ایک مکمل اتالیق ہے، کتاب سے ایک سوال ہزار مرتبہ پوچھنے کے باوجود بھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں پڑتی، اس سے رجوع کرنے کے لئے نہ تو وقت کی قید ہے نہ مقام کی، ریل ہو یا کھیل، جیل ہو یا شادی کی محفل..... کتاب ہمیشہ اپنی باہیں باہیں پھیلائے طالب علم پر اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے، اس سے زیادہ سستا، آسان اور کامل وسیلہ دنیا میں شاید ہی کوئی ہو، کتابوں کے روپ، مقام اور درجے بھی الگ الگ ہیں، ڈکشنری، انسائیکلوپیڈیا، دائرۃ المعارف، ڈائریکٹری، ریڈی ریک نر، درسی اور غیر درسی کتب رسالے، جرنل، میگزین، فوٹو ناول، کامکس، اخبارات، ٹیبل اور چارٹس، مصور کتابیں اور رودادیں یہ سب کتابوں کے ہی زمرے میں آتے ہیں، دنیا کا کوئی کتب خانہ یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس دنیا کی ہر کتاب موجود ہے اور یہ کہ وہ اپنے آپ میں مکمل ہے، واشنگٹن میں امریکہ کی لائبریری آف کانگریس میں روزانہ تقریبا ۲۵ ہزار کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ تعلیمی عمل کی ابتداء گھر یا کلاس روم سے ہوتی ہے لیکن اس کی تکمیل لائبریری میں پہنچ کر ہوتی ہے، دنیا میں اگر آپ سب سے چھوٹی لائبریری دیکھنا چاہیں تو کسی چھوٹے سے بچے کا اسکولی بستہ دیکھ لیجئے مدرسے یا مکتب میں جانے والے

بچے کا بستہ اس کی کل علمی کائنات ہے، اچھے استاذ یا اچھا والدین اسی ننھے منھے کتب خانے کو وسعت دیتے ہیں اور نہایت سلیقے سے بچے کے کندھے سے بستہ اتار کر خود اپنے بچے کو لائبریری کے کندھوں پر لے جا کر بٹھا دیتے ہیں، یہ عمل بہت مشکل بھی ہے اور بہت آسان بھی اس میں راتوں رات انقلاب نہیں لایا جا سکتا بلکہ اس میں تدریجی ترقی درکار ہے، ایک بچہ ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے..... یعنی بالغ شہری بننے تک مختلف طبعی اور جسمانی ذہنی مراحل سے گذرتا ہے، ماہرین تعلیم نے اس ۱۸ سال کی عمر سے کو مزید حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی عمر طبعی کا ایک حصہ ۳ سال کے عرصے پر محیط ہوتا ہے، یہ عرصے اس طرح ہیں:

(۱) شیر خوارگی..... صفر تا تین سال

(۲) ابتدائی بچپن..... ۳/۶ سال

(۳) بچپن..... ۶/۸ سال

(۴) انتہائے بچپن..... ۸/۱۲ سال

(۵) ابتدائے شباب..... ۱۲/۱۵ سال

(۶) عنفوان شباب..... ۱۵/۱۸ سال

(۱) ایام شیر خوارگی یا دوران رضاعت بچہ متحرک اشیاء گانا اور موسیقی کی سریلی آوازوں سے متاثر اور ان کی جانب متوجہ ہوتا ہے، جھنجھنا، باجہ موسیقی والے کھلونے، متحرک کھلونے، رنگ لائٹ اور اسی طرز کی چیزیں اسے متوجہ کرتی ہیں۔

(۲) ۳/۶ سال کے دوران بچہ اشیاء کی جسامت اور ان کے نفع وضرر سے واقف ہو جاتا ہے اور اشیاء کے وزن، مقدار، تعداد اور رنگ وغیرہ میں تمیز کر سکتا ہے، یہ وقت ایسا ہے جب اسے کتابوں سے بالکل ابتدائی تعارف نصیب ہوتا ہے اور بڑوں کے کاغذات اور گھر کی دیواریں اس کے قلم کے زیر نگیں آ کر تختہ مشق بنی رہتی ہیں، اس عمر میں رنگین اور مصور کتابیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں، اس دوران اس کے عصبی خلیات پروٹینی اجزاء کو اپنے اندر زندگی بھر کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔

(۳) آپ اگر کسی کا صحیح بچپن دیکھنا چاہیں تو اس کی عمر کا ۶/ سے ۸ سال تک کے دور کا بغور مشاہدہ کیجیے، فرمائشیں، سوالات اور ضد اس دوران اپنے شباب پر ہوتے ہیں ان دنوں میں

بچہ پڑھنے سے زیادہ رٹنے پر یقین رکھتا ہے، بدنما درسی کتابیں اسے کاٹ کھانے دوڑتی ہیں ،ان دنوں میں اگر اسے کتاب سے ابکائی آنے لگے تو پھر زندگی کے بقیہ دنوں میں کتاب سے مناسبت پیدا کروانا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

(۴) انتہائے بچپن بڑا قیمتی مرحلہ ہے، یہی وہ وقت ہے جب کسی بچے کا رخ لائبریری کی جانب موڑا جاسکتا ہے، کہانیوں کی کتابیں، کامکس، تصویری کہانیاں، فوٹو ناول، اخبارات میں بچوں کا صفحہ اور اسی طرح کی دوسری فرحت بخش چیزیں، درسی کتب کے علاوہ اسے پڑھنے کے لئے دی جاسکتی ہے، ابتداء لائبریری سے نہ ہو بلکہ کتابوں کی دوکانوں سے ہو ،کتابیں خریدنے میں جتنا وقت لگ سکتا ہے لگنے دیں، بالکل جلدی نہ کریں، بلکہ خود بھی بچے بن کر اچھی اچھی کتابوں کا اس کے سامنے ڈھیر لگائیں، ان دنوں میں بچہ فنتاسیہ کو پسند کرتا ہے اور مافوق الفطرت چیزیں اسے بھاتی ہیں، صرف اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس میں ضعیف الاعتقادی، مادی اشیاء، نیز مافوق الفطرت عوامل اور قدرتی مظاہر کا خوف نہ پیدا ہونے پائے، خرید کردہ کتب کو فہرست اور اپنے گھر میں سجانے، دوستوں تک انہیں پہنچانے، دوستوں سے کتابوں کا اشتراک اور لین دین کرنے اور پڑھ چکنے کے بعد انہیں اپنے مدرسے کی لائبریری کو ہدیہ کرنے کے لئے اپنے بچے سے کہیں، مدرسے والوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ اس عمر کے بچوں کے لئے الگ سے ادب اطفال کا شعبہ قائم کریں اور لائبریرین کے عہدے پر نسبتاً کم کریہ المنظر اور غیر خونخوار ذمے دار کا تقرر کریں، جو بچوں کا دوست ہو، کم عمر ہو، بچوں کی نفسیات سے واقف ہو، تازہ ترین اشاعتوں پر اس کی نظر ہو، بہتر ہے کہ کسی بڑے کی نگرانی میں بچے خود اپنی لائبریری کو قائم کریں، لائبریری کا فرنیچر بھی بچوں کی عمر اور دلچسپی کے عین مطابق ہو اور ہر چیز انہیں کھلونا لگے کیوں کہ یہاں سے وہ لائبریری کی بالائی حدوں کو چھونے کے لئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہے ہیں ،اولا یہاں آنے سے بچہ جھجکے گا لیکن دو چار ملاقاتوں میں کھل جائے گا۔

(۵) ۱۲ر تا ۱۵ سال کی عمر کا زمانہ نہایت جذباتی، فعال کچھ کر گذرنے کے خواب دیکھنے والا ہوتا ہے، لڑکیوں اور لڑکوں میں اس عمل کی تقدیم و تاخیر میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوسکتا ہے لیکن اس عمر میں زیر مطالعہ کتابیں اپنا بہت دیرپا نقش چھوڑ جاتی ہیں، جذبہ حب الوطنی

، بہادری، معرکوں اور پہاڑوں کو سر کر جانے اور دریاؤں کو ایک چھلانگ میں پار کر جانے کی ہمت اور جذبہ اور امنگ بھرا انداز اسی عمر میں جاگتا ہے اور اسے صحیح سمت و رفتار یہیں عطا کی جاسکتی ہے، فاتحین اور بہادروں کے قصے، جانباز اور معرکہ آراء افراد کے واقعات، اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کو دوڑنے والی کیفیت، بیداری میں خواب دیکھنا اور نیند میں بیداری کے خوابوں کے مزے لوٹنا اس عمر میں روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں، یہاں وہ فنتاسیہ کو مجسم دیکھنا چاہتے ہیں، ان دنوں میں ماں، باپ، اور استاذ بچے کے لئے ایک ہیرو سے کم درجہ نہیں رکھتے، دنیا بھر کے اچھے اشعار، نظمیں، خوبصورت جملے، واقعات آپ اسی عمر میں یاد کرواسکتے ہیں، چنانچہ لائبریری مہماتی کتب، مہم جوافراد کی سوانح عمریاں، بزرگوں کے قصے، سائنسی اور فنی ایجادات کے مراحل اور اسی طرح دوسری معلوماتی کتب سے پر ہونی چاہیے، اس عمر میں بچے بڑوں کے لباس، نشست و برخاست، تہذیب، اندازِ گفتگو، چال ڈھال اور پیشوں کو نقل کرتے ہیں، عشقیہ داستانوں کی بجائے شہزادوں اور پریوں کے قصے، جنگوں کی داستان، کھیلوں کے مقابلے اور محنت کے کاموں میں ان کا جی لگتا ہے، اس عمر میں چیزیں کیا ہیں کے بجائے بنتی کیسے ہیں؟ تاریخ میں بادشاہوں کے حقیقی واقعات ،تاریخی مقامات کی سیر اور تہذیبی روایتوں کی کھوج انہیں متاثر کرتی ہے، معلومات عامہ سے انہیں خاص لگاو ہوتا ہے، بعض مرتبہ انہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا دشوار ہوجاتا ہے، شادی بیاہ، عید بارات، غم اور خوشی ان کے لئے مخصوص معنی رکھتے ہیں، غصہ اور بے ساختہ ہنسی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں لیکن یہ آنا فانا میں آتے جاتے رہتے ہیں، چنانچہ انہیں ایسی کتابیں پڑھنے کے لئے دی جائیں جن سے ان کی فکر اور جذبات کو مہمیز ملے، اس سے ان کی لائبریری سے دلچسپی بڑھے گی۔

(۶) ۱۵ر تا ۱۸ر سال کی عمر جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن والی ہے جذبات و احساسات اپنی انتہاء پر ہوتے ہیں، اس عمر میں طالب علم سنجیدگی سے کچھ سننے اور کچھ کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے، طبیعت نیکی اور عبادت کی طرف مائل ہوتی ہے، بزرگوں کے واقعات، نبیوں کے اور قرآنی قصے کا بھرپور ذخیرہ ہو تو بچے لائبریری کا رخ ضرور کریں گے، اصلاحی اور معاشرتی ناول اور افسانے اس عمر میں راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھے جاتے ہیں اور آنسو بہائے

جاتے ہیں، بے کسوں اور مسکینوں کے واقعات، فقر وفاقہ اور اللہ کے رضا جوئی کے جو نقوش ۱۲ر تا ۱۸ر سال کی عمر میں نقش ہو جاتے ہیں وہ موت تک ایندھن کے ذخیرے کا کام دیتے ہیں۔

یہ ساری تفصیلات اس لیے بیان کی گئیں کہ بچوں کو لائبریری کا گرویدہ کیسے بنایا جائے؟ درسی کتب ان کے رقیب ہوتی ہیں، غیر درسی اور ان کے نفسیات سے مماثلت رکھنے والی کتابیں انہیں نامعلوم سے معلوم کی طرف لے جاتی ہیں، طبعیات سے اگر دلچسپی پیدا کرنی ہے تو کسی ماہر طبعیات کی سوانح عمری یا کسی بہت مشکل طبعی مشین کی ساخت اور اس کے کاموں کے تجزیے پر مبنی مصور کتاب طالب علم کو غیر شعوری طور پر طبعیات جیسے خشک موضوع کی طرف مائل کرسکتی ہے، یہی عمل تاریخ، معاشیات، ریاضیات، الجبراء اور دیگر خشک مضامین کو دلچسپ بنانے کے لئے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، بعض کتابیں یونیورسل ہوتی ہیں، ان سے بچے اور بڑے یکساں دلچسپی لیتے ہیں، ان میں کہانیاں اور افسانوی ادب کا شمار ہوتا ہے، اب تک کی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ ادب لطف سے اگر مطالعے کی ابتداء کروائی جائے تو ایک خاص عمر کے بعد انسان خود بخود موضوعاتی اور سنجیدہ ادب پڑھنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

بچوں کے سیکھنے کے عمل پر اثر انداز عوامل

تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کے سیکھنے کے عمل پر مندرجہ ذیل عوامل بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

(۱) ذہانت: جو بچہ جتنا زیادہ ذہین ہوتا ہے وہ اتنی ہی آسانی سے سیکھتا ہے اور سیکھی ہوئی باتوں کو نئے حالات پر منطبق یا نئی صورت حال سے نمٹنے میں استعمال کرتا ہے۔

(۲) عمر: پندرہ سولہ سال تک عمر کے ساتھ بچے کی ذہنی عمر میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لیے سیکھنے کا عمل بھی سرعت اور سہولت کے ساتھ برابر جاری رہتا ہے اس عمر تک بچوں کو بہت کچھ سکھایا جاسکتا ہے،، اس کے بعد ذہنی عمر میں کم ہی اضافہ ہوتا ہے اور سیکھنے کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے اور صرف کسی خاص فن یا چند ہی علوم میں مہارت حاصل کرسکتا ہے

، اس لیے ذوق پیدا کرانے اور مختلف علوم وفنون کی شد بد کرادینی چاہیے تا کہ وہ خود یا اس کے بڑے بعد کے مرحلے کے لیے مناسب مضامین ومشاغل کا انتخاب کرسکیں۔

(۳) تجربہ: سیکھے ہوئے کام کو عمل میں لاکر تجربات حاصل کرنے کے لیے جتنے زیادہ مواقع ملیں گے اتنی ہی زیادہ مہارت بھی ہوگی اور اس ضمن میں یا اس طرح کی نئی باتیں سیکھنے میں آسانی بھی ہوگی، اس لیے تجربات کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیے جائیں۔

(۴) تحریک: سیکھنے کے لیے جتنی زور دار تحریک اور بچے کی طرف سے جتنی زیادہ آمادگی ہوگی اتنی ہی زیادہ وہ قوت لگائے گا اور اتنی ہی سخت محنت اور غیر معمولی جدوجہد کرے گا، نتیجے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا، اس لیے کچھ سکھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لیے پورے طور پر آمادہ کرلینا چاہیے۔

(۵) مزید تقویت: سیکھنے کے دوران میں انعام یا شاباشی کے ذریعے برابر مزید تقویت بہم پہنچاتے رہنا چاہیے، اس سے سیکھنے کے عمل میں آسانی اور رفتار ترقی میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے، بچے اپنی کوششوں میں جس درجہ بھی کامیابی کا مظاہرہ کریں گے اس پر انہیں شاباشی ملنی چاہیے اور ان کی کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور مختلف طریقوں سے ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیے، اس سے چستی اور دلجمعی پیدا ہوتی اور قوت کارکردگی بڑھتی ہے، انعامات پوزیشن، نمبر سندات وغیرہ اس سلسلے کے مفید حربے ہیں۔

(۶) خوشگوار نتیجہ: سیکھنے کے دوران اگر جدوجہد کا اطمینان بخش نتیجہ بھی آنکھوں کے سامنے آتا رہے تو جدوجہد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کامیابی بذات خود بہت زبردست محرک ہے، اس لیے بچوں کو اپنی کوششوں کے نتائج کے مشاہدہ کرنے کے برابر مواقع ملنے چاہیں۔

(۷) اعادہ: اعادہ اور تکرار جتنا زیادہ موقع ملے گا سیکھنے کا عمل اتنا ہی زیادہ آسانی اور سرعت سے انجام پائے گا اور اس سے متعلق نئی نئی باتیں سیکھنے کی بھی تحریک ہوگی۔

(۸) تعلق خاطر: بچوں میں نئی باتیں جاننے یا نئی چیزیں سیکھنے کی جتنی زیادہ تڑپ بے چینی اور لگن ہوگی اتنی ہی زیادہ توجہ انہماک اور کوشش سے وہ اسے سیکھیں گے، لگن اور پیاس پیدا کرنے یا تجسس ابھار دینے سے سکھانے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے، بغیر تعلق خاطر کے کچھ سیکھنا سکھانا مشکل ہے۔

حاضری کا مسئلہ:

یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جس سے تقریباً تمام تعلیمی اداروں کو دوچار ہونا پڑتا ہے ،غیر سرکاری ابتدائی مدارس کو تو یہ مسئلہ اور زیادہ پریشان کرتا ہے، حاضری اور وقت کی پابندی کے معاملے میں اساتذہ اور طلبہ دونوں سے کوتاہیاں ہوتی ہیں جس کا تعلیم وتربیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے، اساتذہ کی غیر حاضری یا دیر حاضری سے تعلیم کا نقصان تو ہوتا ہی ہے، درجے اور مدرسے کا نظم وضبط بھی بری طرح متاثر ہوتا ہے ، بچے درجے میں مار پیٹ ،لڑائی جھگڑا اور شوروغل کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں ،درجہ اور مدرسے کی فضا سے سنجیدگی رخصت ہوجاتی ہے ،جھگڑے نمٹانے کے لیے کافی وقت خرچ کرنے اور نظم وضبط قائم کرنے کے لیے ڈنڈا استعمال کرنے کی ضرورت پیش آنے لگتی ہے، بچے کی غیر حاضری سے جہاں صرف ایک بچے کا نقصان ہوتا ہے ،معلم کی غیر حاضری یا دیر حاضری یا درجے میں تاخیر سے پہنچنے کے نتیجے میں چالیس طلبہ کی ایک پوری جماعت کا نقصان ہوتا ہے۔ دینی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اس ضمن میں کوتاہیاں حیرت ناک بھی ہیں اور افسوس ناک بھی کیوں کہ جس ملت کے افراد پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں پابندی وقت کے ساتھ فرض ہیں، جس کے افراد کو سات برس کی عمر سے نماز کی پابندی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، جو لوگ وقت کو اللہ کی امانت سمجھتے اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ایک ایک لمحہ کا اللہ کو حساب دینا ہوگا ان کو تو پابندی وقت کے معاملے میں ساری دنیا کے سامنے بہترین نمونہ پیش کرنا چاہیے ،عذر شرعی کے بغیر حاضری یا دیر حاضری ان کے نزدیک تو کسی حال میں جائز نہیں، ایسی صورت میں کوتاہی کسی بنیادی خامی کا پتہ دیتی ہے۔

حاضری کا پابند بنانے کی تدابیر

(۱) طلبہ، اساتذہ اور سرپرستوں کو حاضری اور وقت کی پابندی کی اہمیت پورے طور پر ذہن نشین کرادی جائے اور خلاف ورزی پر گرفت کی جائے۔

(۲) ادارے کی ذمہ دار حاضری اور وقت کی پابندی کے ضمن میں اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔

(۳) وقت مقررہ پر پابندی سے گھنٹی بجنے کا اہتمام کیا جائے، یہ گھنٹی طلبہ کو چوکنا کرنے کے لیے ہو، اساتذہ کو اس گھنٹی سے پہلے پہنچنے کا پابند بنایا جائے

(۴) درخواست یا اجازت نامے کے ذریعے رخصت لینے کا پابند بنایا جائے اور بغیر درخواست یا اجازت کے غیر حاضر ہونے پر یا تاخیر سے آنے پر شدت سے نوٹس لیا جائے۔

(۵) حاضری کا ریکارڈ قائم کرنے والے طلبہ یا درجات کی ہمت افزائی کی جائے اس کے لیے نمبر، سند، شیلڈ یا انعامات بھی رکھے جاسکتے ہیں ،اسی طرح بغیر معقول عذر کے غیر حاضری پر سرزنش، جرمانہ اور امتحانات میں بیٹھنے یا ترقی پانے سے محروم بھی کیا جاسکتا ہے۔

(۶) وقتاً فوقتاً طلبہ کا طبی معائنہ کرایا جائے تاکہ ان کی صحت کی طرف والدین کو بروقت توجہ دلائی جاسکے۔

(۷) طلبہ اور اساتذہ دونوں کی حاضری کے لیے باقاعدہ رجسٹر رکھے جائیں، اساتذہ اپنی حاضری کے رجسٹر پر دستخط کے ساتھ آمد کا وقت بھی نوٹ کرلیا کریں۔

بھگوڑے بچے:

بعض بچے سرے سے تعلیم ہی سے بھاگنے لگتے ہیں ، یہ بہت بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے، تعلیم سے بھاگنے کے عموماً مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں۔

(۱) اساتذہ کی سختی، بے رخی یا بدسلوکی ،اگر معلم شفیق ہو اور بچوں کی شخصیت کا احترام کرے تو بچے تعلیم کے راستے کی متعدد دشواریاں بہ خوشی جھیل لیتے ہیں لیکن اساتذہ کا برتاؤ اچھا نہ ہو تو وہ بہ مشکل ٹکیں گے۔

(۲) بچے کے سامنے اساتذہ یا ادارے کی تنقیص۔

(۳) مدرسے کا غیر دلچسپ ماحول جس میں بچوں کو کھیل کود ،تعمیری مشاغل اور تعلیمی سیر وسیاحت کے مواقع نہ ملتے ہوں۔

(۴) ہم جماعت طلبہ کا نامناسب برتاؤ، مارنا پیٹنا، چڑانا، طعن وطنز، تذلیل وتحقیر وغیرہ، خواہ یہ برتاؤ جسمانی واخلاقی عیب کی وجہ سے ہو یا والدین کی افلاس اور وسائل کی کمی سے۔

(۵) گھر یا محلّہ پڑوس میں ایسے ساتھیوں کی موجودگی جو کھیل کود، خوش گپیوں اور سیر وتفریح

میں لگے رہتے ہوں۔

(۶)علالت یا طویل غیر حاضری کی وجہ سے درجے میں اپنے مقام سے گر جانا۔

(۷)ذہنی یا جسمانی کم زوری کی باعث درجے میں نہ چل سکنا۔

(۸)بچے کی تعلیم وتربیت کی طرف سے والدین کی لاپروائی۔

(۹)ذہین بچوں کو ان کی رفتار کے مطابق درجے میں کام نہ لینا۔

(۱۰)عدم توجہی یا گھر کی مصروفیات وغیرہ کے باعث ہوم ورک پورا کرنے یا آموختہ دیکھنے میں کوتاہی۔

صحیح اسباب کی کھوج لگا کر اصلاح حال کی پوری کوشش کرنی چاہیے، خدانہ خواستہ کوئی بچہ اساتذہ یا ادارے کی کوتاہیوں کے باعث دینی تعلیم وتربیت سے بھاگنے لگا تو کتنا بڑا وبال ہوگا۔

پھسڈی پن:

ہر درجے میں کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو درجے کے ساتھ نہیں چل سکتے، یہ پھسڈی کہلاتے ہیں، یوں تو تقریباً ہر بچہ وقتی طور پر کسی نہ کسی مضمون میں سست روی کا ثبوت دیتا ہے، یہ فطری ہے اس پر کسی خاص تشویش کی ضرورت نہیں، یہ چیز معمولی توجہ سے جلد یا بدیر اپنے آپ دور ہوجاتی ہے، الا یہ کہ بچے اپنے اساتذہ، ہم جولیوں یا گھر کے افراد کے طنز وتعریض اور ناروا سلوک یا کسی اور وجہ سے احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہوجائیں جس سے بہ ہر حال بچوں کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، البتہ کچھ بچے واقعی کند ذہن اور غبی ہوتے ہیں اور علمی مضامین میں ان کا ذہن عام بچوں کی طرح تیز رفتاری سے کام ہی نہیں کرسکتا اور بعض ذہنی اعتبار سے اچھے خاصے ہونے کے باوجود کسی کسی مضمون میں پچھڑ جاتے ہیں، یہ بچے ہماری غیر معمولی توجہ کے مستحق ہیں۔

غبی اور کند ذہن بچوں کا پھسڈی پن تو خیر ان کی ذہنی کمزوری اور فہم کی کمی کے باعث ہوتا ہے، انہیں تو ان کی اپنی رفتار ہی سے چلانا مناسب ہوگا جس کے لیے نصاب، طریق تعلیم اور نظام الاوقات سب میں رعایت رکھنی ہوگی، رہے وہ پھسڈی بچے جو ذہنی

طور پر تو نارمل ہیں لیکن بعض وجوہ سے پھسڈی ہوگئے ہیں تو پہلے ان اسباب کا پتہ لگانا ہوگا جو ان کے پھسڈی پن کے موجب ہوئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے ازالہ کی تدبیر کرنی ہوگی۔

پھسڈی پن کا علاج:

پھسڈی پن ایک ایسی خطرناک بیماری ہے جس کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو بچے علم سے کورے رہ جاتے ہیں، اور ان کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے، والدین اور اساتذہ کی کوتاہیوں کے باعث بسا اوقات اچھے بھلے لڑکے بھی اس مہلک مرض کا شکار ہوکر رفتہ رفتہ اپنے کو تباہ کرلیتے ہیں، بچوں کا نہایت دقت نظری سے جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور پھسڈی پن کے آثار نمودار ہوتے ہی صحیح اسباب کا پتہ لگا کر ازالہ کی بروقت فکر کرنی چاہیے، اگر گھر یا مدرسہ کا ماحول ناسازگار ہے تو اسے سازگار بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، بصارت میں یا سماعت میں نقص ہے تو اس کا علاج کرانا چاہیے، بہ ہر حال جو سبب بھی ہو اسے دور کرنے میں جلدی ہونی چاہیے تو امید ہے کہ بروقت کام بن جائے گا لیکن اگر یہ مرض کسی حد تک پرانا ہوگیا تو بچے کی زندگی گئی کام سے۔

تکان: دیر تک لکھنے پڑھنے یا کوئی ذہنی، جسمانی کام کرنے سے جسم میں پستی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں، اور بالآخر نہ دماغ ٹھیک کام کرتا ہے اور نہ جسم میں کام کی مزید سکت رہتی، یہی تکان دراصل ایک طرح کی تنبیہ ہے کہ تازہ دم ہوئے بغیر مزید کام نہ کیا جائے ورنہ جسم کو نقصان پہنچے گا۔

تکان کے اسباب:

کام کرنے میں قوت صرف ہوتی ہے، یہ قوت جسم ہی کے بعض اجزا کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے، ان اجزا کو جلا کر انہیں قوت میں تبدیل کرنے کا کام خون میں ملی ہوئی آکسیجن انجام دیتی ہے۔

چناچہ جب ہم دیر تک کام کرتے ہیں تو:

(۱) قوت میں تبدیل ہونے والے اجزا جل جاتے ہیں۔

(۲) خون میں ملی ہوئی آکسیجن کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مزید قوت پیدا کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق نہیں ملتی۔

(۳) جلا ہوا مسموم فضلہ خون میں شامل ہوکر پورے جسم میں پھیل جاتا ہے، چناں چہ جسم کے ساتھ دماغ بھی متاثر ہوتا ہے اور جوڑ جوڑ میں جہاں فضلہ رکتا ہے درد ہونے لگتا ہے۔

ظاہر ہے جب تک اس کا ازالہ نہ ہوجائے مزید کام کرنا انتہائی مضر ہوسکتا ہے لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تکان کے ڈر سے زیادہ محنت نہ لی جائے، تکان کی بڑی اہمیت وافادیت ہے، بچے جب خوب محنت کرتے ہیں تو بھوک بھی خوب لگتی ہے کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا ہے، گہری نیند آتی ہے اور جسم کے جو اجزا بنتے ہیں وہ زیادہ قوی ہوتے اور نشوونما میں مدد دیتے ہیں۔

تکان کی قسمیں:

تکان دو طرح کی ہوتی ہیں (۱) ذہنی (۲) جسمانی

ذہنی کام کرنے سے دماغ تھکتا اور ذہنی تکان ہوجاتی ہے اور جسمانی کام کرنے یا کھیلنے کودنے سے جسم تھکتا اور جسمانی تکان واقع ہوجاتی ہے، جسمانی یا ذہنی کسی ایک طرح کی تکان کے بھی بہت بڑھ جانے سے دوسری طرح کی تکان خود بخود ہوجاتی ہے، جسم تھک کر چور چور ہوجائے تو دماغ بھی کام ٹھیک نہیں کرتا۔

ذہنی تکان کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی تکان (۲) مصنوعی تکان یا بیزاری واکتاہٹ نہیں لگتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تکان ہوگئی ہے، اگر کسی طرح دل چسپی پیدا کردی جائے تو مزید کام ہوسکتا ہے۔

تکان کی علامتیں:

جب مندرجہ ذیل علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو سمجھنا چاہیے کہ بچے تھک گئے ہیں اور اب تکان کے ازالے کی مناسب تدابیر ہونی چاہیے،

جسمانی علامتیں:

(۱) جسم میں ڈھیلا پن اور چستی وحرکت میں کمی۔

(۲) جوڑوں میں درد ہونا، بار بار انگڑائی لینا یا جمائی آنا یا اونگھنا۔

(۳) خلاف توقع حرکات کا سرزد ہونا۔

(۴) سر لٹک جانا، ریڑھ کی ہڈی کا جھک جانا۔ نگاہوں کا نہ جمنا یا کھڑے ہونے میں سہارا لینے کی کوشش کرنا۔

(۵) چہرے پر پھیکا پن، کملاہٹ۔

ذہنی علامتیں:

(۱) توجہ کا بار بار بھٹکنا۔

(۲) یادداشت میں کمی آجانا۔

(۳) سوال حل کرنے یا جواب دینے میں بار بار غلطیاں کرنا۔

(۴) سمجھانے پر بات سمجھ میں نہ آنا، غور وفکر اور یادداشت میں کمی۔

(۵) بار بار جھنجھلانا یا آواز پر چونک جانا وغیرہ۔

جلد تھکادینے والے حالات:

کارکردگی پر ان حالات کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے جن میں کوئی کام انجام دیا جارہا ہو، موسم خوش گوار اور فضا پرسکون ہو، کام دلچسپ اور طبیعت کام پر آمادہ ہو تو کام بھی نہایت انہماک اور توجہ سے ہوتا ہے اور دیر تک تکان بھی محسوس نہیں ہوتی، اس کے برعکس مندرجہ ذیل صورتوں میں بچے تھک جاتے ہیں اور توجہ، انہماک اور دلچسپی سے کام کرنے کے بجائے اکتاہٹ اور بیزاری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔

(۱) موسم کی شدت، شدید سردی، شدید گرمی، تیز دھوپ، امس، کہر ودھند وغیرہ۔

(۲) مدہم روشنی یا صاف اور کھلی ہوا کی کمی۔

(۳) بہت زیادہ یا مسلسل شور وغل اور ڈانٹ پھٹکار یا سزا۔

(۴) خراب صحت، ناقص غذا، ناموزوں لباس، تکلیف دہ نشست گاہ اور کمرے کی ناموزونیت۔

(۵) فطری خواہشات یا جبلی تقاضوں کا پورا نہ ہونا۔
(۶) آمادہ کیے بغیر سبق شروع کرا دینا سبق کا مشکل، غیر دلچسپ اور نا قابل فہم ہونا۔
(۷) ایک ہی طرح کا کام ایک ہی انداز یا پوسچر میں کرتے رہنا کیوں کہ اس طرح جسم کے ایک ہی حصہ کے اجزا قوت خارج کرتے کرتے جلد تھک جاتے ہیں۔
ان اسباب کے ازالے کی جس حد تک فکر کی جائے گی کارکردگی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

تکان کا علاج :

بچے اگر واقعی تھک جائیں تو انہیں ستانے کے لیے کچھ وقفہ ملنا چاہیے اور کھانے کے لیے ایسی غذا جس میں مٹھاس شامل ہو، اس سے بچے تازہ دم ہو کر کام کے لائق ہو جائیں گے لیکن تکان غیر معمولی ہو تو معمولی آرام سے کام نہیں چلتا بلکہ مکمل آرام اور گہری نیند بھی ضروری ہے، کیوں کہ اس طرح قوت پیدا کرنے والے جلے ہوئے اجزا کی جگہ نئے اجزا تیار ہو سکیں گے، چائے اور قہوہ وغیرہ سے وقتی طور پر توانائی محسوس ہونے لگتی ہے مگر تکان کا یہ حقیقی علاج نہیں ہے بلکہ ان کا پینا اور ان کے سہارے دیر تک کام کرنا، بچوں کیا بڑوں کے لیے بھی نہایت مضر ہے، ان کے بجائے بچوں کے لیے بھیگا ہوا چنا یا گڑ، اور اگر استطاعت ہو دودھ دہی، پھل وغیرہ کا استعمال تکان کو دور کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے۔
البتہ اگر تکان معمولی ہو یا محض بیزاری اور اکتاہٹ کی وجہ سے بچے تکان کا مظاہرہ کرتے ہوں تو مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کی جائیں۔:
(۱) مختلف تدابیر سے سبق کو دلچسپ اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔
(۲) آمادگی، خوش دلی اور ہمت و حوصلہ کی فضا میں بچوں سے کام لیا جائے۔
(۳) کام کی نوعیت میں تبدیلی کر دی جائے یعنی ذہنی کے بعد جسمانی، زبانی کے بعد عملی، پڑھائی کی جگہ لکھائی وغیرہ۔
(۴) مختلف تدبیروں سے رفتہ رفتہ بچوں کو دیر تک جم کر کام کرنے کا عادی بنایا جائے، بچوں کی توجہ جلد جلد بھٹکتی رہتی ہے اور شروع میں ایک چیز پر زیادہ دیر تک جم نہیں پاتے، لیکن جب محنت کے عادی ہو جاتے ہیں تو بھر دیر تک تکان محسوس نہیں کرتے۔

نظام الاوقات

ضرورت وافادیت :

بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت کچھ انحصار موزوں نظام الاوقات پر ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے:
(۱) تعلیم و تربیت کا کام نظم و ترتیب سے ہوتا ہے۔
(۲) وقت ضائع نہیں ہوتا، محدود وقت میں کافی کام ہو جاتا ہے۔
(۳) ہر ضروری مضمون اور مشغلہ کو مناسب وقت مل جاتا ہے اور کوئی بھی نظر انداز نہیں ہوتا۔
(۴) اساتذہ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے کام کی تقسیم ہوتی ہے چناں چہ ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔
(۵) کام متوازن ہوتا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے اساتذہ کے ذوق اور رجحان پر ضروری روک لگ جاتی ہے ورنہ اگر پورا وقت ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو اکثر اساتذہ اپنے ذوق اور دلچسپی ہی کے مضامین پر زیادہ وقت صرف کریں گے اور متعدد پہلو نظر انداز ہو جائیں گے۔
(۶) وقت کی پابندی اس کی قدر و قیمت کا احساس، محنت و انہماک اور ترتیب سے کام کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔
(۷) طلبہ ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں، چناں چہ نظم و ضبط برقرار رہتا ہے، مصروفیت کے باعث شرارتوں کا موقع نہیں ملتا، اس لیے سزا کی بھی کم ہی نوبت آتی ہے۔
(۸) طلبہ اور اساتذہ سب کو علم رہتا ہے کہ فلاں گھنٹہ میں کیا کرنا ہے، چناچہ ضروری تیاری پہلے ہی سے کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔
(۹) صدر مدرس اور دوسرے ذمہ داران ادارہ کو ہر وقت اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ کوئی مدرس یا کسی درجہ کے طلبہ کہاں اور کس کام میں منہمک ہوں گے۔

احساس برتری وکمتری وکہتری اوراحساس برابری:

آج کے سائنسی تجربات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ حیوانات کے علاوہ نباتات میں بھی احساس ہوتا ہے، جیسے چھوئی موئی کے پودے کو ہاتھ لگانے سے تھوڑی دیر کے لئے مرجھا جاتا ہے، اسلامی تعلیمات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح حیونات اور نباتات میں احساس ہوتا ہے اسی طرح جمادات میں بھی احساس کا عنصر پایا جاتا ہے، جیسے حضورﷺ کی مسجد میں کھجور کے سوکھے درخت کے تنے کا حضورﷺ کی جدائی سے رونا۔

ابوجہل کے ہاتھ کی کنکریوں کا کلمہ شہادت پڑھنا، اور پتھروں کا حضورﷺ کو سلام کرنا، بہ ہرحال یہ احساسات کی دنیا ہے، اس میں اگر بچوں کے احساس سے بے اعتنائی برتی جائے تو کتنا بڑا ظلم ہے، اس لیے اس سبق میں ہم بچوں کے اندر پیدا ہونے والے احساس کا مطالعہ کریں گے۔

(۱) احساس برتری: احساس برتری اس احساس کو کہتے ہیں جو غیر شعوری طور پر بچے میں پنپتا ہے، پھر وہ بچہ خود کو دوسرے بچوں سے بہتر اور اعلیٰ تصور کرتا ہے، ان سے اختلاط کو عیب سمجھتا ہے، لیکن یہ احساس کمتری سے کم نقصاندہ ہے۔

(۲) احساس کمتری: احساس کمتری اس احساس کو کہتے ہیں جو غیر شعوری طور پر بچے میں پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بچہ اپنے کو دوسرے بچوں سے کم تر سمجھتا ہے، ایسا بچہ کبھی آگے ترقی کرنے کے بارے میں نہیں سوچتا، عام طور پر احساس کمتری کی یہ نفسیاتی بیماری ان بچوں میں ہوتی جن کو ان کی غلطی پر، یا کام نہ کرسکنے پر، کام بگڑ جانے پر بہت ٹوکا اور مارا جاتا ہے، اس کو ایسے لقب وغیرہ سے پکارا جاتا ہے جس لقب میں کمی کا اظہار ہوتا ہے، جیسے بزدل۔ بیوقوف، کام چور، پھوہڑ وغیرہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں دس سال تک حضورﷺ کا خادم رہا مگر حضورﷺ نے کبھی بھی میری غلطی پر نہ ڈانٹا، نہ مارا اور کبھی یہ نہیں فرمایا: ایسا کیوں نہیں کیا؟

یہاں حضورﷺ کا بچوں کی نفسیات پر مہارت کا ثبوت ملتا ہے، بعض مرتبہ ان طالب علموں میں بھی یہ کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے جن کے گھر کا ماحول انگریزی بولنے کا

نہیں ہوتا اور وہ انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں، چوں کہ انگریزی بلاتکلف سمجھنے اور بولنے کی عادت نہیں ہوتی، اس لئے سبق سمجھ میں نہیں آتا اور وہ خود کو کند ذہن سمجھنے لگتے ہیں، یہ احساس لڑکیوں میں جلدی پیدا ہوتا ہے، یہ نفسیاتی بیماری احساس برتری سے زیادہ نقصاندہ ہے، لیکن احساس کہتری سے کم سنگین ہے۔

(۳) احساس کہتری: احساس کہتری اس احساس کو کہتے ہیں جو غیر شعوری طور پر بچے میں ابھرتا ہے، اس کی سوچ گھٹیا ہوجاتی ہے اور بچہ خود کو مجرم شمار کرتا ہے، اس کی طبیعت جرائم کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے، چوری، جھگڑا، لڑائی، دوسروں کا مذاق اڑانا اور لڑکیوں کو چھیڑنا، ایسا بچہ اپنے استاذ کو یا اپنے ماں باپ کو اپنا خیر خواہ کے بجائے دشمن سمجھتا ہے، یہ نفسیاتی بیماری اکثر بری صحبت سے پیدا ہوتی ہے، یا بچہ کی خواہشات کو دبانے اور ہر وقت مارنے اور ڈانٹ پھٹکار کرنے سے وہ اپنے بڑوں کے مخالف سوچنا شروع کردیتا ہے، اور اپنی ضروریات ومسائل بڑوں سے حل کرانے کے بجائے خود حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لیے ضرورت پڑنے پر پیسے چوری کرتا ہے چاہے اپنے گھر سے یا کہیں اور سے ہو، جوا کھیل کر پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بعض مرتبہ گھر سے بھاگ جاتا ہے، اسٹیشنوں پر عام طور پر جو لاوارث بچے پائے جاتے ہیں وہ اس احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، یہ نفسیاتی بیماری لڑکوں میں زیادہ لڑکیوں میں کم ہوتی ہے، یہ نفسیاتی بیماری سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، اس بیماری سے ایک دوسری بیماری بھی پیدا ہوتی ہے جس کو احساس خوف کہتے ہیں۔

(۴) احساس برابری: احساس برابری اس احساس کو کہتے ہیں جو دانستہ اور شعوری طور پر بچوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ بیماری نہیں بلکہ اچھی صفت ہے، اسلامی تعلیمات میں احساس برابری پیدا کرنے کے لئے نماز دی گئی ہے، آقا وغلام ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

شہری ودیہاتی کو جمعہ کی نماز میں ایک صف میں کھڑا کرکے برابر کردیا، اسی طرح

عید میں پورے علاقہ کو ایک ساتھ کھڑا کردیا، اور حج میں تو اقوام عالم کو ایک ہی لباس میں ایک میدان میں جمع کر کے احساس برابری کا سبق دیا، حضور ﷺ نے فرمایا:

"لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأحمر علی أسود ولا لأسود علی أحمر الا بالتقوی ان أکرمکم عند اللہ أتقاکم [شعب الایمان: ۵۱۳۷]

کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی سرخ رو کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ رو پر کوئی شرف نہیں سوائے تقوی کی وجہ سے اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جس سب سے زیادہ متقی ہو۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

جب بچوں میں احساس برتری جاگتا ہے تو وہ تعلیم میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح آپسی جذبہ تنافس سے مدرسہ اور مکتب کا معیار تعلیم اونچا ہوتا، احساس برابری پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۱) **یکساں لباس** : لباس کے فرق سے بچے کیا بڑے بھی نفسیاتی طور پر متاثر ہوتے ہیں جن مدرسوں میں یکساں ہم لباس کا اہتمام نہیں ہوتا وہاں کے خوش پوشاک بچوں میں احساس برتری اور معمولی پوشاک پہننے والے بچوں میں احساس کمتری جلد پیدا ہوتی ہے، بچوں میں اس احساس برابری کو پیدا کرنے کے لئے مدرسہ اور مکتب میں ہم لباس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

(۲) **معلم کی توجہ** : اگر استاذ کی چند ذہین بچوں کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے، تو دوسرے بچے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے معلم کو چاہیے کہ کسی ایک یا دو بچے کی طرف اپنے میلان کا اظہار ذرا بھی نہ ہو بلکہ تمام بچوں پر یکساں نگاہ رکھے اور ہر ایک پر برابر توجہ رکھے۔

(۳) **برے القاب**: بعض اساتذہ کچھ بچوں کو گھٹیا القاب سے پکارتے ہیں، جیسے بدھو، بیوقوف، نالائق، وغیرہ اس طرح کے القاب سے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے، وہ

خود کو اسی لقب کے مطابق سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے برے القاب سے پکارنے سے پرہیز کیا جائے، قرآن میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ولا تنابزوا بالألقاب برے لقب سے نہ پکارو۔

(۴) **عدل وانصاف**: امتحانات میں نمبر دینے کا معاملہ ہو یا سالانہ جلسہ میں انعام وغیرہ دینا ہو، صرف چند طلبہ پر نظر کرم اور التفات نہیں ہونا چاہیے، بلکہ عدل وانصاف سے کام لیتے ہوئے ہر طالب علم کو اپنی صلاحیت کو پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

(۵) **حوصلہ افزائی**: جس بچے میں احساس کمتری کا مرض موجود ہو تو اس کے علاج کا آسان طریقہ یہ ہیکہ اس کے معمولی کارنامہ کی بھی خوب ہمت افزائی کی جائے جس کی وجہ سے اس میں حوصلہ پیدا ہوگا، اور وہ احساس کمتری سے نکلے گا۔

حوصلہ ہو تو اڑانوں میں مزہ آتا ہے
اپنی ناکامی کا غم بھی چلا جاتا ہے

ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ جماعت ہو رہی ہے اور لوگ رکوع میں پہنچ گئے تو وہ وہیں سے ہی نیت باندھ کر رکوع میں شامل ہو گئے پھر رکوع ہی میں آہستہ آہستہ چل کر صف میں شامل ہو گئے، جب نماز ختم ہو گئی تو انہوں نے آپ ﷺ سے ذکر فرمایا تو آپ ﷺ نے پہلے تو ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور فرمایا: زادك اللہ حرصا اللہ تمہارے اس جذبہ کو اور بڑھائے اور پھر فرمایا لا تعد اس طرح آئندہ نہ کرنا [مؤطا امام محمد: ۱۵٤]

اس حدیث سے ہمیں یہ اصول ملتے ہیں کہ (۱) طلباء کی غلطی پر فورا تنبیہ نہ کی جائے جیسے آپ ﷺ نے تنبیہ نہیں کی (۲) بلکہ پہلے کام کرنے پر حوصلہ افزائی کی جائے، آپ ﷺ نے پہلے دعائیہ جملہ میں حوصلہ افزائی فرمائی پھر بعد میں (۳) غلطی کی اصلاح کی جائے جس طرح حضور ﷺ نے اصلاح فرمائی، اور اصلاح میں یہ نہیں فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا۔ [مثالی استاذ: ۳۴۶]

نہ مارو تم نہ دھمکا کے سزا دو
تم اپنے چھوٹوں کو حوصلہ دو

بچوں کی تعلیم وتربیت میں گھر اور مدرسہ کا تعاون:

بچوں کی تعلیم وتربیت کا منظم ادارہ مدرسہ ہے، مدرسہ میں باصلاحیت اساتذہ کی ایک جماعت اس فریضہ کو بہ حسن وخوبی انجام دینے پر مامور ہوتی ہے، دیہی علاقوں میں معاشرے کی اصلاح کے مراکز بھی یہی مدرسے شمار ہوتے ہیں، اس لیے بجا طور پر ان سے بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں، مدرسے میں داخل کرنے کے بعد والدین عموماً اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت سے غافل ہوجاتے ہیں، انہیں اطمینان ہوجاتا ہے کہ اب یہ کام مدرسہ خود انجام دے گا، اساتذہ بھی والدین کی عدیم الفرصتی یا جہالت کے باعث انہیں معذور سمجھتے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش نہیں کرتے۔ اس طرح تعلیم وتربیت کا پورا بار جو مل جل کر ہی اٹھایا جاسکتا ہے تنہا مدرسہ پر آتا ہے، جسے وہ محدود وقت میں کسی طرح نہیں اٹھا پاتا اور وہ توقعات پوری نہیں ہوتی جو عموماً مدرسے سے وابستہ کرلی جاتی ہیں اس لیے اپنے فرائض سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ بچوں کے والدین خصوصاً ان کی ماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) اساتذہ خوش اخلاق اور ملنسار ہوں، روابط قائم کرنے کے لیے وقت نکالیں، کشادہ دلی سے ملیں اور عزت سے پیش آئیں۔

(۲) ان کے اعتراضات، شکایات یا مشورے خندہ پیشانی سے سنیں۔

(۳) ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور بھلائی وبہتری میں پوری دلچسپی لیں۔

(۴) تعلیم وتربیت سے متعلق ان کی ذمہ داریوں کو اچھے الفاظ میں یاد دلاتے رہیں۔

(۵) مدرسے کی مختلف تقریبات میں انہیں شرکت کے لیے مدعو کریں اور پروگرام میں حتی الامکان ان کی دلچسپیوں کا لحاظ کریں۔

(۶) وقتاً فوقتاً سرپرستوں کے اجتماعات منعقد کریں۔

تعلیمی ہفتہ یا سالانہ جلسہ:

ہر مدرسے کو سال میں ایک بڑی تقریب ضرور منانی چاہیے، اس سے متعدد

فائدے ہوں گے۔

(۱) ادارے کی خدمات سے لوگ متعارف ہوں گے اور اس کی اہمیت وافادیت کا انہیں اندازہ لگانے کا موقع ملے گا۔

(۲) پبلک میں اثر ونفوذ کا ذریعہ ہاتھ آئے گا، لوگوں کا تعاون اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے راہیں کھلیں گی اور ادارے کی توسیع وترقی سے دلچسپی لینے والوں کا حلقہ وسیع ہوگا۔

(۳) طلبہ کی عملی تربیت کے لیے مواقع ملیں گے اور ادارے سے ان کی عمومی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔

(۴) بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا لوگوں میں احساس پیدا ہوگا اور دینی تعلیم کی ترویج واشاعت میں اضافہ ہوگا۔

(۵) گردوپیش کی اصلاح اور لوگوں میں دینی روح بیدار کرنے کا موقع ملے گا۔

پروگرام

اس تقریب کا پروگرام مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہوسکتا ہے، اپنے حالات، موثر اور کامیاب پروگرام نہ چلا سکے تو آس پاس کے چند اداروں کو مل کر باری باری ایک ادارے میں یہ کام انجام دینا چاہیے۔

(۱) دین کے تقاضے اور دینی تعلیم کی اہمیت وافادیت وغیرہ پر اصحاب صلاحیت حضرات کی تقاریر کا اہتمام، تقریریں مختصر، جامع، سنجیدہ اور موثر ہونی چاہیں اور ایک نشست میں دو سے زیادہ نہ ہوں۔

(۲) بیت بازی، تقاریر، خوش نویسی اور مضمون نگاری وغیرہ کے مقابلے

(۳) ادبی مجلس کا اہتمام یا بچوں کا نقلی مشاعرہ جس میں بچے مشہور شعراء کی دلچسپ اور سبق آموز نظمیں سلیقے سے پیش کریں۔

(۴) بچوں کی طرف سے خطاب عام، اس میں بچے پبلک کے سامنے مختصر تقاریر، مکالمے چٹکلے، لطیفے، موثر نظمیں، سبق آموز کہانیاں وغیرہ مختلف زبانوں میں پیش کریں۔

(۵) جلسہ تقسیم انعامات، مختلف مقابلوں میں کامیاب ہونے والے، اپنا پروگرام سلیقے سے

پیش کرنے والے، امتحانات میں پوزیشن لانے والے، نمائش کے لیے اچھا سامان تیار کرنے والے بچوں کو انعامات دیے جائیں، انعامات میں مفید، دلچسپ اور قابل فہم کتابیں لکھنے پڑھنے کا سامان، سرٹیفکٹ، تعلیمی کھلونے دینے چاہیں، انعام بہ ہر حال انعام ہے، اس کا قیمتی ہونا ضروری نہیں ہے۔

قابل لحاظ امور

اس تقریب کو مفید، موثر اور کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) تقریب خوشگوار موسم میں رکھی جائے اور ضروری پروگرام ایسے وقت رکھے جائیں جب زیادہ تر لوگ فارغ ہوں اور بآسانی شرکت کر سکیں، مثلاً خطاب عام، ادبی مجلس، بچوں کا مشاعرہ، نمائش وغیرہ رات میں اور مختلف قسم کے مقابلے دن میں، اگر موسم اجازت دے تو ششماہی اور سالانہ امتحان کے بعد رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے، تدریس کا زیادہ ہرج نہیں ہوتا اور تیاری کا خوب موقع ملتا ہے۔

(۲) تفصیلی پروگرام کی اچھی طرح تشہیر ہو۔

(۳) ادارے کو مقامی پارٹی بندیوں سے الگ تھلگ رکھا جائے تاکہ ہر ایک تقریب میں شرکت کر سکے۔

(۴) تقریر وغیرہ میں جزئی اختلافات کو چھیڑنے سے گریز کیا جائے تاکہ غلط فہمی پھیلنے کا یا پھیلانے کا موقع نہ ملے، اصلاحی پروگرام بھی عمومی اور ایجابی نوعیت کے ہوں، بچوں سے بڑوں پر کوئی تنقید ہرگز نہ کرائی جائے۔

(۵) وہی پروگرام پیش کیے جائیں جن کی اچھی طرح تیاری اور خوب مشق کر لی گئی ہو۔

(۶) چھوٹوں، بڑوں عورتوں، مردوں سب کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھا جائے۔

(۷) دعوت نامہ کے اجرا میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا جائے۔

(۸) کوشش کی جائے کہ ہر طالب علم اپنی عمر اور صلاحیت کے لحاظ سے کسی نہ کسی پروگرام میں حصہ ضرور لے۔

(۹) تمام کام اپنی نگرانی میں حتی الامکان طلبہ سے انجام دلائے جائیں تاکہ انہیں ہر طرح

کے کاموں کا عملی تجربہ ہو۔

(۱۰) شرکاء کی عزت کی جائے اور انہیں ہر امکانی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

اسباق اور ان کے پڑھانے کا طریقہ:

اسباق کی کامیابی کا انحصار تین باتوں پر ہے:

(۱) معلم کا محنت سے سبق تیار کرنا۔

(۲) درجے کے سامنے سلیقے سے سبق کو پیش کرنا۔

(۳) طلبہ کا سبق کی طرف پوری توجہ دینا۔

اسباق کی تیاری:

پڑھانے سے پہلے سبق کو بہ خوبی تیار کر لینا چاہیے، تیاری کے بغیر سبق پڑھانا معلم کی شان کے منافی اور علم کی توہین ہے، جو لوگ ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں وہ سبق کا حق بھی ادا نہیں کر پاتے اور بسا اوقات ان کی بڑی بھد ہوتی ہے۔

تیاری کی اہمیت:

تیاری کے بغیر کبھی سبق کامیاب اور موثر ہو ہی نہیں سکتا، سبق خواہ آسان ہو یا مشکل اور درجہ خواہ اونچا ہو یا نیچا، تیاری بہ ہر حال ضروری ہے کیوں کہ:

(۱) سبق تیار کر لینے سے استاذ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

(۲) وہ طلبہ کے سامنے اپنی بات پورے وثوق، اعتماد اور سلیقے سے رکھتا ہے۔

(۳) تدریس کا موزوں ترین طریقہ اختیار کرتا ہے، چناں چہ طلبہ کو کما حقہ فائدہ پہنچتا ہے۔

(۴) طلبہ کو بہ خوبی مطمئن کر سکتا ہے۔

بعض پرانے اور تجربہ کار اساتذہ اس زعم میں بغیر تیاری کے سبق پڑھانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ سبق تو ہمارا پہلے کا پڑھایا ہوا ہے، اس کی تیاری کی اب کیا ضرورت ہے، لیکن یہ ان کی زبردست بھول ہے، تجربہ بلاشبہ کامیاب تدریس میں بڑا معاون ہوتا ہے

لیکن تیاری سے بالکلیہ بے نیاز نہیں کرسکتا، کیوں کہ ہر سال درجہ میں جو نئے طلبہ آتے ہیں ،ان کی لیاقت سابقہ پچھلے برسوں کے طلبہ سے مختلف ہوتی ہے، چناچہ بسا اوقات سبق کا پورا ڈھانچہ بدل دینا پڑتا ہے، سابقہ طریقہ تعلیم بھی کام نہیں دیتا، تمہید اور موزوں سوالات بالکل نئے سوچنے پڑتے ہیں، علاوہ ازیں اس کی بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ معلم کو ہر وقت ضروری مواد مستحضر رہے گا، ہوسکتا ہے کہ سبق کا کچھ جزو ذہن سے محو ہوگیا ہو پھر تو درجے کے سامنے بڑی سبکی ہوگی اس لیے تیاری بہ ہر حال استاذ کے لیے ناگزیر ہے۔

تیاری میں قابل لحاظ امور:

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کس درجے اور کس گھنٹے میں کیا سبق پڑھانا ہے، کتنے وقت میں سبق پورا کرنا ہے، جن بچوں کو پڑھانا ہے ان کی عمر، صلاحیت اور دلچسپیاں کیا ہیں ،اس سبق کے ضمن میں وہ پہلے سے کیا جانتے ہیں، جو کچھ پڑھانا ہے اس کے مواد پر خود استاد کو کہاں تک عبور ہے، جو کمی ہو وہ پوری کرلی جائے۔

(۲) ضروری مواد یکجا کرلینے کے بعد اسے دو تین مناسب اجزا میں تقسیم کرکے کل کا ایک عنوان اور اجزا کے ذیلی عنوانات قائم کرلئے جائیں اور پھر ہر جز کی پیش کش کے طریقے سوچ لیے جائیں۔

(۳) سبق کے لیے طلبہ کے ذہن کو آمادہ کرنے کے لیے مناسب تمہید سوچ لی جائے اور لیاقت سابقہ جانچنے کے لیے چند سوالات بنالیے جائیں۔

(۴) ہر جز کے بعد یا سبق کے آخر میں جو سوالات کرنے ہوں وہ بھی بنالیے جائیں۔

(۵) طلبہ کی مشکلات اور الجھنوں کا پیشگی اندازہ لگالیا جائے، اور ان کے ازالے کی تدابیر سوچ لی جائیں۔

(۶) سبق کو بہ خوبی ذہن نشین کرانے کے لیے ضروری تعلیمی وتوضیحی سامان، نقشے، چارٹس وغیرہ وغیرہ تیار یا فراہم کرلی جائیں۔

(۷) طلبہ کو نوٹ کرانے کے لئے یا تختہ سیاہ پر درج کرنے کے لیے سبق کا خلاصہ مرتب کرلیا جائے۔

(۸) سبق سے متعلق ہوم ورک یا اور کوئی تفویض بھی پہلے سے سوچ رکھی جائے۔

(۹) طلبہ سے سوالات حل کرانے ہوں وہ پہلے ہی سے حل کرالیے جائیں، ان کے سامنے سائنس کا جو تجربہ کسی مضمون سے متعلق جو عملی مظاہرہ کرنا ہو پیشگی اس کی مشق کرلی جائے تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

(۱۰) نئے استاذ کو چاہیے کہ اختصار سے سبق کے تحریری اشارات تیار کرلیا کرے، تجربہ کار اساتذہ کو بھی مختصر نوٹ ضرور لے لینا چاہیے۔

سبق کی تیاری کے لے لیے ناگزیر شرائط:

مندرجہ بالا کام اس وقت بہ خوبی انجام پاسکتا ہے جب:

(۱) استاذ کو جو سبق پڑھانا ہے اس کے مواد پر اسے عبور یا جو فن سکھانا ہے اسے ضروری مہارت حاصل ہو۔

طلبہ سے اس کا گہرا ربط ہو تاکہ وہ ان کی لیاقت سابقہ، ان کی فطری صلاحیتوں ان کی نفسی کیفیات اور ان کی انفرادی خصوصیات سے بہ خوبی واقف ہو۔

(۲) مختلف تدریسی طریقوں کا اسے علم ہو۔

(۳) تعلیم کے بنیادی مقصد اور ہر مضمون کی قدر و قیمت سے بہ خوبی واقف ہو۔

(۴) موزوں سوالات بنانے کا اسے سلیقہ آتا ہو۔

(۵) توضیحی و تعلیمی سامان بنانے کی صلاحیت یا فراہم کرنے کے وسائل ہوں۔

(۶) اسباق تیار کرنے کی ضرورت وافادیت کا احساس ہو اور اس کے لیے وقت نکالنے کی فکر ہو۔

اسباق کی قسمیں:

اسباق عموماً تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) معلوماتی: جن کا مقصود بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے، مثلاً فقہ، سیرت، تاریخ ،جغرافیہ، سائنس وغیرہ کے اسباق۔

(۲) عملی یا مہارتی: جن کا مقصود کسی فن میں مہارت پیدا کرنا ہوتا ہے مثلاً آرٹ کرافٹ

،سلائی بنائی،خوش نویسی وغیرہ کے اسباق۔

(۳)تنقیدی یا تفریظی: جن کا مقصود حسن وقبح اور بھلائی برائی کی پرکھ پیدا کرنا یا ذوق سلیم اور جذبات لطیف کو پروان چڑھانا ہوتا ہے،مثلاً اسلامیات،ادب،قرأت نظم خوانی وغیرہ کے اسباق۔

ان اسباق کی بھی مزید دو نوعیتیں ہوتی ہیں

(۱)جدید سبق: وہ ہے جس کے ذریعے کوئی نیا اصول یا ضابطہ ذہن نشین کرایا گیا ہو مثلاً ریاضی یا قواعد کے اصول وضابطے یا کچھ نئی معلومات فراہم کی گئی ہو مثلاً تاریخ،جغرافیہ سائنس وغیرہ کے تحت نئی معلومات۔

(۲)مشقی یا اعادی سبق: جس کا مقصود پہلے سے بتائے ہوئے کسی قاعدے یا ضابطے کی مشق کرانا یا سابقہ معلومات کا اعادہ کرانا ہوتا ہے۔

ڈانٹ پھٹکار،مار پیٹ کے نقصانات:

استاذ کا اپنے نفس پر قابو پانا: حضورﷺ کو اللہ تعالی نے انسانیت کی تربیت کے لیے مبعوث فرمایا،اور فرمایا **فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم.**

اللہ کی رحمت کی وجہ سے آپ ان لوگوں کے لیے نرم دل ہیں اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس جمع نہ ہوتے،لہذا ان کو معاف کرو۔اس آیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تعلیم وتربیت میں سخت کلامی یا ڈانٹ پھٹکار کو اختیار کرنے سے طالبین دور ہوجاتے ہیں۔

عن عمار بن ياسر رضى الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :من ضرب مملوكه ظلما أقيد منه يوم القيامة .

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: جس نے ناحق اپنے ماتحت کو مارا تو اس کی وجہ سے وہ قیامت کے دن قید کیا جائے گا۔

عن أبى هريرة رضى الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم :من ضرب مملوكه سوطا اقتص منه يوم القيامة .

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو اپنے ماتحت کو ایک کوڑا بھی ظلم سے مارے گا تو قیامت کے روز اس کا بھی بدلہ لیا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک علاقہ کے گورنر حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں تحریر فرمایا: **اياك والغضب والقلق والضجر** [بدائع الصنائع :۹/۷]۔

دیکھو! غصہ گرمی سے،بے چینی اکتاہٹ اور ڈانٹ پھٹکار سے بچنا۔

جس طرح ایک حاکم کے لیے ضروری ہے کہ جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کرے،اسی طرح ایک استاذ کو بھی چاہیے کہ غصہ،جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کرے اس لئے کہ طلبہ ایک طرح سے محکوم ہیں اور وہ حاکم ہیں۔

تعمیر شخصیت:

جس طرح بچوں کی صلاحیت کی تعمیر کم عمری میں کی جاتی ہے،اسی طرح اس کی نفسیات کی تعمیر بھی کم عمری میں ہوتی ہے،یہاں نفسیات کی تعمیر کے چند اصول پیش کیے گئے ہیں،جو ایک شخصیت کے کردار کو بنانے کے لیے زریں اصول ہیں۔

(۱)جس بچے کی ہر وقت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے،غیر جو چاہتے ہیں سزا دیتے ہیں آپ تو اپنے ہیں حوصلہ دیجئے۔

(۲)جس بچے سے شفقت کا معاملہ کیا جاتا ہے وہ فرماں بردار بن جاتا ہے۔

(۳)جس بچے سے سچائی کا معاملہ کیا جاتا ہے وہ انصاف پسند ہوجاتا ہے۔

(۴)جس بچے کو تنبیہ کے لیے اللہ تعالی سے ڈرایا جاتا ہے وہ متقی بن جاتا ہے۔

(۵)جس بچے کی ہمیشہ مار پیٹ کی جاتی ہے وہ باغی ہوجاتا ہے۔

(۶)جس بچے کی مانگ اصرار کرنے اور رونے کے بعد پوری کی جاتی ہے وہ ضدی ہوجاتا ہے۔

(۷)جس بچے پر بھروسہ نہیں کیا جاتا وہ دھوکہ باز بن جاتا ہے۔

(۸) جس بچے پر شفقت نہیں کی جاتی وہ مجرم بن جاتا ہے۔
(۹) جس بچے کا ہر وقت مذاق اڑایا جاتا ہے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
(۱۰) جس بچے پر ہر وقت تنقید کی جاتی ہے وہ نافرمان ہو جاتا ہے۔
(۱۱) جس بچے کو موہوم چیز سے ڈرایا جاتا ہے وہ بزدل ہو جاتا ہے۔
(۱۲) جس بچے پر ہر وقت غصہ اور ڈانٹ پھٹکار کی جاتی ہے وہ لڑاکو بن جاتا ہے۔
(۱۳) جس بچے پر ہر وقت غصہ، اور ڈانٹ پھٹکار کی جاتی ہے اس کے ذہن میں تشنج (ٹینشن) پیدا ہوتا ہے، جو اس کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ کا عادی بناتا ہے۔
(۱۴) بچے کو مار پیٹ کرنے والے مربی سے انسیت کے بجائے بعد پیدا ہوتا ہے۔
(۱۵) بعض اساتذہ مار پیٹ کرنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں جس سے طلبہ کو جسمانی نقصان پہونچتا ہے، بسا اوقات ایسا استاد شریعت میں ظالم قرار پاتا ہے، لیکن وہ مار پیٹ کو اپنا حق اور ثواب کا حقدار سمجھتا ہے۔

پڑھتا ہے نماز جنازہ میری مرا قاتل
گناہ کر کے ہوتا ہے ثواب میں داخل

(۱۶) مار پیٹ کی وجہ سے بعض طلباء تعلیم ترک کر دیتے ہیں، یا ان کے والدین ہی مار پیٹ کی وجہ سے تعلیم ترک کروا دیتے ہیں۔
(۱۷) بعض مرتبہ مار پیٹ کی وجہ سے بچے گھر سے بھاگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ برے لوگوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔ اور ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے، اسٹیشنوں پر اکثر ایسے بچے ملتے ہیں۔

اساتذہ جس قدر چاہیں طلبہ کو ان کی کوتاہیوں پر سزا دیں ان کے لئے نہ شرعی حد ہے اور نہ کسی کی طرف سے کوئی پابندی، غصہ جب تک ٹھنڈا نہ ہو جائے سزا پوری نہیں ہوتی، مجھ سے ایک ساتھی نے بتایا کہ میرے ایک استاذ قمچیوں سے مجھے اتنا مارا کرتے تھے کہ میں دائیں، بائیں کروٹ نہیں سو سکتا تھا، پوری رات چت لیٹنا تھا اس ساتھی کی بات جب مجھے یاد آجاتی ہے تو میرا دل درد میں ڈوب جاتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے مہمانوں کی پٹائی ! کیا نبی ﷺ نے پوری زندگی صحابہ کو تعلیم نہیں دی ! کیا صحابہ رضی اللہ عنھم اجمعین اپنے

شاگردوں کو تعلیم نہیں دیتے تھے، کیا اس شعبے کی رہبری شریعت میں نہیں ملتی ! سزا اور تادیب کے لئے کوئی اصول یا کوئی حد متعین نہیں ہے ! اگر یہ بے جا غصہ اور اس کا غلط استعمال نہیں تو اور کیا ہے ! مرنے کے بعد حساب کتاب ہوگا، بے سینگھ والی بکری کو سینگھ والی بکری نے مارا ہوگا اس کا بھی حساب ہوگا، میزان عدل قائم ہوگا، کیوں مارا، کتنا مارا، کیسے مارا، کہاں مارا، کس نیت سے مارا، کہاں کا غصہ کہاں اتارا؟ اللہ تعالی کو سب خبر ہے ۔

ظالم کو کبھی خدا نہیں ملا کرتا یہاں کی تاویلیں کل قیامت کے میدان میں سب دھری رہ جائیں گی کسی کے بنانے میں خود اجڑ گئے اس لیے لکھا گیا کہ یہاں تو یہ جواب دیدیں گے کہ وہ پڑھتا نہیں تھا اس لیے مارا اگر اسی جواب سے آخرت میں چھٹکارا پا جائیں تو اور ماریئے۔

کوئی بچہ نہیں پڑھتا تو اس کے والدین کو بلا کر اسکے حوالے کر دینا چاہیے کہ آپ کا بچہ نہیں پڑھتا، یا اہتمام والوں کے حوالے کر دینا چاہیے کہ یہ پڑھتا نہیں کل امتحان میں ناکام ہو تو ذمہ داری میری نہیں میں اس پر سختی کر کے اپنی آخرت اجاڑنا نہیں چاہتا۔

ایک مدرسہ میں سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے استاذ نے طالب عام کو جون کی گرمی میں دھوپ میں کھڑا کر دیا، آدھے پونے گھنٹے کے بعد، دھوپ کی تاب نہ لا کر بچہ وہیں گر پڑا کچھ دیر بعد بے ہوشی جیسی رہی لڑکوں نے اٹھایا اور پانی پلایا کچھ دیر کے بعد لڑکے کو ہوش آگیا، مگر استاذ کو اب بھی ہوش نہیں آیا طلبہ سے کہنے لگے کہ استاذ کی مار بدن کے جس حصے پر لگ جائے وہاں جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے استاذ کی مار اور سزا کو کبھی برا نہیں سمجھنا چاہیے، استاذ کی مار ایسی ہوتی ہے جیسے کھیتی کے لیے پانی۔

کاش کہ استاذ کے ذہن میں سزا کی اہمیت کے ساتھ ساتھ شریعت کی بھی کچھ اہمیت ہوتی ! یہ مضمون لکھا ہی جا رہا تھا کہ ایک دکھیارے باپ نے بتایا کہ میرے بچے کو استاذ نے اتنا مارا کہ اس کی داہنی ران کالی ہوگئی وہ داہنی کروٹ نہیں سو سکتا تھا، کیا دین کی تعلیم کے نام پر ایسے مظالم کے جواز کی کوئی صورت ہو سکتی ہے !

ایک اور واقعہ سنئے ! مدرسے کے ایک طالبعلم نے اپنے ساتھی کو بتلایا کہ قاری صاحب تم پر بہت ناراض ہیں پوچھا کیوں، کیا بات ہے؟

اس نے جواب دیا کہ ان کا کپڑا تم نے صاف نہیں دھویا تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس صابون نہیں تھا اور پیسے بھی نہیں تھے کہ کپڑے دھونے کا صابون خریدوں، اس لئے میں نے اپنے نہانے کے صابون سے ہی ان کے کپڑے دھودیے، اس لیے ٹھیک سے صاف بھی نہیں ہوئے اور میرا صابن بھی ختم ہوگیا، اس جمعہ کو تو میں نے بغیر صابن کے ہی غسل کیا، کچھ ہی دیر کے بعد استاذ اور طالب علم کا آمنا سامنا ہوگیا، استاذ نے کہا: کیوں؟ تو نے کپڑا دھویا تھا.... یا ویسے ہی پریس کر کے رکھ دیا تھا؟ لڑکا ڈر اور خوف کے عالم میں صابن کا عذر کرنا چاہا مگر ڈر کی وجہ سے اپنی بات نہ کہہ سکا، استاذ اس کو جس قدر برا بھلا کہہ سکتے تھے، سب کچھ کہا اور غصے میں کہنے لگا کہ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ صاف نہیں دھوئے گا تو اور کسی اور سے دھلوالوں گا؟ اب یہ بات اچھی طرح یاد کرلے کہ جب تک تو یہاں رہے گا، تجھے ہی میرے کپڑے دھونے ہوں گے، اور اسی طرح صاف دھوئے گا جیسا میں پہنتا ہوں۔ آئی بات سمجھ میں؟ بھول گیا کیا کہ پچھلے ہفتے کیسی مار پڑی تھی؟ اب بھی پیٹھ دکھتی ہوگی، آج چھوڑ دیتا ہوں۔ (بڑا احسان کیا) کیا استاذ محترم اپنی اولاد کے لیے بھی ایسی سزائیں پسند فرمائیں گے؟

اذا شئت أن تسود عشيرة

فبالحلم سد لا بالتسرع والشتم

اگر تو کسی قوم پر سرداری کرنا چاہتا ہے تو بردباری اختیار کر نہ کہ غصہ گرمی اور گالی گلوچ۔

جسمانی تربیت:

اللہ تعالی نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، اس منصب کے شایان شان اسے ایک سڈول جسم عطا فرمایا ہے، جسم میں متعدد ضروری اور متوازن اعضاء رکھے ہیں، طرح طرح کی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، انسان کی قوتیں وصلاحیتیں اسی وقت بروئے کار آسکتی ہیں جب اس کا جسم تندرست وتوانا ہو، اس لئے ہمیں بچے کی جسمانی نشوونما اور صحت وتندرستی کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے، یہ کام گھر اور مدرسے کے تعاون سے ممکن ہوگا۔

جسمانی نشوونما کے لیے ضروری چیزیں:

صحت وتوانائی کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں:

(۱) متوازن غذا (۲) صاف پانی (۳) تازہ ہوا (۴) مناسب روشنی (۵) جسمانی محنت یا ورزش اور کھیل (۶) موزوں لباس (۷) صفائی ستھرائی (۸) گہری نیند (۹) مسرت وشادمانی (۱۰) پاکیزہ سیرت۔

غذا

غذا میں وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں شامل ہوں جو جسم کی مناسب نشوونما کے لیے ضروری ہیں، غذا اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ کام کاج کے لیے جسم کو قوت اور حاصل ہو، کام یا حرکات وسکنات میں جسم کا جو جز کام آگیا یا ٹوٹ گیا ہے اس کی مرمت ہوجائے، جسم کے بڑھنے اور نشوونما پانے میں مدد ملے، بیماری کے جراثیم سے لڑنے کی جسم میں سکت وصلاحیت پیدا ہو۔

صاف پانی

صحت کے لیے دوسری ضروری چیز صاف پانی ہے، ہر آدمی کو ایک دن رات میں کم وبیش ڈیڑھ سیر پانی پینا پڑتا ہے۔

پانی کی مدد سے دوران خون ٹھیک رہتا ہے اور خون جسم کے ہر حصہ تک بآسانی پہنچ جاتا ہے، غذا بخوبی ہضم ہوتی اور جزو بدن بنتی ہے، جسم کی حرارت متوازن رہتی ہے، جسم کے اندر کی گندگی اور سمیت پیشاب پسینہ، تھوک بلغم وغیرہ کے ساتھ باہر نکلتی ہے، معدہ آنتیں اور نالیاں وغیرہ دھل کر صاف ہوجاتی ہیں۔

پانی صاف اور تازہ ہونا چاہیے، صاف پانی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا مزہ رنگ یا بو نہ ہو، گندہ پانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے، متعدد مہلک بیماریاں اسی سے پھیلتی ہیں، اس لیے صاف اور تازہ پانی حاصل کرنے کا پورا اہتمام ہونا چاہیے، وبائی امراض کے زمانے میں پانی ابال کر پینا چاہیے۔

تازہ ہوا

صحت کے لیے تیسری اہم چیز صاف اور تازہ ہوا ہے، زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت وافادیت محتاج بیان نہیں، صاف پانی کی طرح صاف ہوا میں بھی نہ تو کوئی رنگ ہو نہ مزہ اور نہ بو، صاف ہوا حاصل کرنے کے لیے مکان ہوادار ہونا چاہیے، کھلے میدان میں کھیلنے اور باغوں یا پارکوں میں ٹہلنے گھومنے کا موقع ملنا چاہیے، منھ کھول کر ہوادار جگہوں میں سونے کی عادت ڈالنی چاہیے، صحن میں پودے لگانے کا اہتمام ہو سکے تو تھوڑے بہت پھول پودے ضرور لگانے چاہئیں۔

روشنی

صحت کے لیے چوتھی ضروری چیز روشنی ہے جو پودے روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں وہ پیلے پڑ جاتے ہیں اور ان کی نشو ونما رک جاتی ہے، شہروں کی تنگ وتاریک گلیوں میں رہنے اور گھٹی گھٹی فضا میں سانس لینے والوں کے مقابلے میں دیہات کی روشن اور کھلی فضا میں پلنے والوں کی صحت کا موازنہ کر کے روشنی کی ضرورت وافادیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

روشنی حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں:

(۱) فطری: مثلاً سورج اور چاند سے (۲) مصنوعی: یعنی چراغ، لالٹین، بجلی وغیرہ سے۔

سورج کی روشنی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے، مکان میں دھوپ آنے کی پوری گنجائش ہونی چاہیے اس سے مکان میں سیلن بھی نہیں رہتی اور بیماریوں کے جراثیم مر جاتے ہیں، پڑھنے لکھنے یا باریک کام کرنے کے لیے کافی روشنی ہونی چاہیے لیکن روشنی سامنے یا دائیں سے نہ آئے بلکہ بائیں سے یا اوپر یا پیچھے سے آئے تو آنکھوں پر برا اثر نہیں پڑتا، بہت مدھم یا بہت تیز روشنی آنکھوں کو خراب کر دیتی ہے، پڑھنے لکھنے یا باریک کام کرنے والوں کو روشنی کے استعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیے، کافی روشنی میں کام کریں اور آنکھوں پر براہ راست روشنی نہ پڑنے دیں۔

محنت مشقت یا ورزش اور کھیل: اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جسم کام کاج اور محنت ومشقت کے لیے دیا ہے، جسمانی محنت ہی سے جسم کے اعضاء مضبوط ہوتے ہیں، ان میں چستی وتوانائی آتی ہے، بھوک خوب لگتی، گہری نیند آتی اور کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا اور جو کچھ کھائیے جزو بدن بنتا ہے، جسم کے اندر کی گندگی اور سمیّت بآسانی باہر نکل جاتی اور طبیعت بشاش رہتی ہے جس عضو سے کام نہیں لیا جاتا وہ رفتہ رفتہ کم زور ہو کر بیکار ہو جاتا ہے، اس لیے محنت مشقت کا عادی بننا چاہیے، البتہ لکھنے پڑھنے، ذہنی کام کرنے یا دکان پر بیٹھنے والے لوگوں کو عموماً جسمانی محنت کا موقع کم ملتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت جسمانی ورزش یا کھیل کے لیے ضرور نکالیں، جسمانی محنت سے جو لوگ جی چراتے ہیں ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے وہ سست، کاہل اور دوسروں پر بار بن کر رہتے ہیں۔

موزوں لباس:

صحت کے لیے موزوں لباس بھی ضروری ہے، لباس وہی موزوں ہوتا ہے جس سے ستر بہ خوبی چھپ جائے اور بے پردگی نہ ہوتی ہو، گرمی سردی اور موسمی اثرات سے جسم محفوظ رہے، جسم کو کسی طرح کی گزند یا نقصان نہ پہنچے، جسم کے مناسب آرائش وزیبائش ہوتی ہو، شائستگی، وقار، وضع داری اور ملی غیرت وحمیت کا مظاہرہ ہوتا ہو، چست لباس صحت کے لیے بہت مضر ہے، اس سے دوران خون متاثر ہوتا ہے، جسم کو ضروری مقدار میں تازہ ہوا نہیں ملتی اور جسم کے اندر اور باہر کا درجہ حرارت یکساں رہتا ہے، لباس میں ستر کی طرف سے بے پروائی، غیروں کی نقالی، بے جا تکلف وتصنع یا گندگی ولاپروائی وغیرہ مختلف قسم کے اخلاقی ونفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہے جو بالواسطہ جسمانی صحت کے لیے بھی مضر ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔

صفائی ستھرائی:

صحت وصفائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلام نے طہارت کو ایمان کا جز قرار دیا ہے، صحت کے لیے ضروری ہے کہ جسم، لباس، رہائش گاہ، برتنے کے سامان، نالیوں اور گردوپیش کی صفائی کا اہتمام کیا جائے، ان میں سے کسی کی صفائی کی

طرف سے لاپروائی صحت کو متاثر کرسکتی ہے ۔جسم کے اندر طرح طرح کا فضلہ، گندگی اورزہریلا مادہ اکٹھا ہوتا رہتا ہے اس کا باہر نکلتے رہنا ضروری ہے کیوں کہ کسی طرح کا بھی فاسد مادہ رک جائے تو آدمی بیمار ہوجائے، یہ گندگی پاخانے، پیشاب ۔بلغم وغیرہ کی شکل میں مختلف راستوں سے باہر نکلتی رہتی ہے، جہاں اس گندگی کو باہر نکالنے کا پورا اہتمام ہونا چاہیے وہیں ان راستوں کو بھی خوب صاف رکھنا چاہیے جن سے یہ گندگی باہر نکل کر انہیں بھی گندہ کردیتی ہے، پاخانہ پیشاب کے بعد سلیقے سے آب دست لینا، پابندی سے مسواک کرنا ،ناک میں پانی ڈال کر خوب صاف کرنا، آنکھوں اور کانوں کو برابر صاف کرتے رہنا، بال اور ناخن ترشوانے کا اہتمام کرنا چاہیے، نیز پابندی سے غسل کرکے جلد کے ان سوراخوں کو کھلا رکھنا چاہیے جو پسینہ کی وجہ سے میل سے بند ہوجاتے ہیں، میلا کچیلا لباس کھال کو گندہ کرکے مختلف قسم کی جلدی بیماریوں میں مبتلا کردیتا ہے ،اس لیے لباس کی صفائی کا پورا اہتمام ہونا چاہیے ،کمرے ،برآمدے ،صحن میں برابر جھاڑو دینا ،سامان کو گردوغبار سے بچانا، چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر سلیقے سے ترتیب دینا، باورچی خانے ،نالیوں اور پاخانہ پیشاب خانہ وغیرہ کی صفائی کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے، گھر کے آس پاس بھی گندگی نہ ہونی چاہیے ورنہ جراثیم پلیں گے اور گھر بھر کی صحت متاثر ہوگی۔

گہری نیند:

صحت کے لیے نیند بھی نہایت ضروری ہے، ذہنی، جسمانی کام، کھیل کود اور جسم کے اندر ہونے والی حرکات کے باعث جسم تھک کر چور ہوجاتا ہے، تکان دور کرنے اور تازہ دم ہوکر پھر کام کاج کے لائق ہونے کے لیے آرام اور گہری نیند ضروری ہے۔

مسرت وشادمانی:

رنج وغم گھن کی طرح جسم کو کھوکھلا کردیتا ہے اور بسا اوقات تپ دق کا شکار بنادیتا ہے، جنون، خودکشی، حرکت قلب کا بند ہونا، قبل از وقت بوڑھا ہوجانا، یہ سب غیر معمولی رنج وغم ہی کے شاخسانے ہیں، خوش وخرم رہنے سے صحت اچھی رہتی ہے اور امراض کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت مدافعت بڑھتی ہے، خود بھی خوش رہنا چاہیے اور بچوں کو خوش وخرم

رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، رنج وغم کے موقع اگر آہی جائیں تو جلد ان کو بھلادینے یا ان کی تلافی کردینے کی فکر ہونی چاہیے تاکہ جسم کو یہ گھن نہ لگنے پائے، اللہ پر بھروسہ اور توکل انسان کو ہر طرح کے رنج وغم سے نجات دے دیتا ہے، ہر حال میں اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

پاکیزہ سیرت:

آخری لیکن صحت وعافیت کے لیے سب سے مقدم شرط پاکیزہ سیرت ہے، سب کچھ حاصل ہو لیکن سیرت گھناؤنی ہو تو انسان کی صحت رفتہ رفتہ برباد ہوجاتی ہے، اس کے برعکس صحیح عقائد، صالح اعمال، نیک چال چلن، پسندیدہ عادات واطوار، صلہ رحمی، حسن سلوک، نصح وخیرخواہی، خدمت خلق وغیرہ سے خدا اور خلق دونوں خوش ہوتے ہیں، چناں چہ اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے، موٹا جھوٹا کھا کر بھی خوش وخرم رہتا ہے، اس کی صحت سنورتی اور عمر بڑھتی ہے، ہمارے آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بدچلنی اور برے عادات واطوار انسان کو طرح طرح کے مہلک امراض میں مبتلا کردیتے ہیں، آخرت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ صحت اور دنیوی فلاح کے لحاظ سے پاکیزہ سیرت اور پسندیدہ عادات نہایت ضروری ہیں ،آئندہ نسلوں کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ سب سے زیادہ اس طرف توجہ دے۔

بچوں کی صحت اور مدرسہ:

مدرسے کا کام صرف لکھنا پڑھنا سکھادینا ہی نہیں ہے ،جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ طلبہ کی صحت اور جسمانی تربیت کی طرف توجہ دینا بھی مدرسے کا بنیادی فریضہ ہے کیوں کہ:

جسمانی حیثیت سے بچوں کی نشوونما کا بہترین دور مدرسے ہی میں گزرتا ہے ،والدین کی جہالت، حفظان صحت کے اصولوں سے ان کی ناواقفیت، رہن سہن کی خرابیاں اور معاشرے کی زبوں حالی کے اس دور میں مدرسے ہی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بچوں کی صحت کے ضمن میں مناسب مدد اور رہنمائی کرے گا، بچوں کی صحت ہی اچھی نہ ہوگی تو ان کی تعلیم وتربیت کیسے ہوسکے گی ،اس لیے پڑھائی لکھائی پر صحت کو قربان کردینے کا جو غلط

تصور پھیل گیا ہے وہ انتہائی مضر اور مہلک ہے، مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد صرف ہڈی چمڑا واپس نہیں جانا چاہیے بلکہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے توانا وتندرست جسم بھی ملنا چاہیے۔

اساتذہ کا ادب:

طالب عالم کو چاہیے کہ اساتذہ کا ادب واحترام اپنے اپنے اوپر لازم سمجھے ،حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرو اور علم کے لیے متانت پیدا کرو اور وقار پیدا کرو جس سے تعلیم حاصل کرو اس سے خاکساری برتو۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ بوڑھے مسلمان اور عالم حافظ قرآن ،بادشاہ عادل اور استاذ کی عزت کرنا تعظیم خداوندی میں داخل ہے۔

ابن وہبؒ کہا کرتے تھے امام مالکؒ کے ادب سے مجھے جو کچھ ملا علم سے اتنا نہیں ملا، شعبہؒ فرماتے: جس سے ایک بھی حدیث میں نے سنی اسی کا غلام ہوں، استاذ کے سامنے زیادہ بولنے کے بجائے اس کی بات کو توجہ سے سنے! اس کے سامنے زیادہ بولنا بے ادبی ہے کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو ادب کے ساتھ دریافت کرے۔

حضرت حسینؓ نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت کی استاذ کی صحبت میں خود بولنے سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کرنا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ میں لگاتار دو برس تک ارادہ کرتا رہا کہ امیر المومنین عمر فاروقؓ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کروں گا مگر ادب اور رعب کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی، ایک مرتبہ حج کے موقع پر مرالظہر ان میں جب وہ قضاء حاجت سے فارغ ہو کر واپس ہونے لگے تو میں نے دل کڑا کر کے عرض کیا، امیر المومنین ایک حدیث کے متعلق دو برس سے سوال کرنا چاہتا ہوں مگر آپ کا رعب بولنے نہیں دیتا، فرمایا یہ نہ کیا کرو، جب کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ لیا کرو علم ہوگا تو بتادوں گا ورنہ کہہ دوں گا میں نہیں جانتا، کسی اور سے پوچھ لو، اسی طرح سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ میں نے سعید بن مالکؒ سے کہا: آپ سے کچھ دریافت کرنا ہے مگر ہیبت کی وجہ سے زبان نہیں کھلتی ،فرمایا: بھائی! مجھ سے ہرگز مرعوب نہ ہو جو کچھ پوچھنا ہو بے کھٹکے پوچھ لیا کرو، عرض کیا

:پوچھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں تشریف لے جاتے وقت حضرت علیؓ سے کیا فرمایا تھا؟ جواب دیا یہ فرمایا تھا اے علی! تم کیا پسند نہیں کرتے کہ مجھ سے تمہاری وہی نسبت ہو جو موسی سے ان کے بھائی ہارون کو تھی۔

امام احمد بن حنبلؒ ادب کی وجہ سے اپنے استاذ کا نام نہیں لیتے تھے، بلکہ ان کا ذکر ان کی کنیت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

امام بخاریؒ سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آپ کے دل میں کوئی خواہش ہے فرمایا: خواہش یہ ہے کہ میرے استاذ علی بن مدینیؒ حیات ہوتے اور میں جا کر ان کی صحبت اختیار کرتا۔

امام ربیعؒ فرماتے ہیں کہ اپنے استاذ امام شافعیؒ کی نظر کے سامنے مجھ کو کبھی پانی پینے کی جرأت نہ ہوئی، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے سامنے میں ورق بھی آہستہ الٹتا تھا کہ اس کی آواز ان کو سنائی نہ دے، امام یوسفؒ نے فرمایا: انسان کو اپنے استاذ کی مدارات واجب ہے، اس کی سختی کو برداشت کرے، استاذ کو اچھی بات بتائے یا کسی بری بات پر تنبیہ کرے تو اس کی شکر گذاری ضروری ہے جب وہ کوئی نکتہ بتائے تو تمہیں اگر وہ پہلے سے معلوم ہو جب بھی یہ ظاہر نہ کرو کہ مجھے پہلے سے معلوم ہے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علیہ الرحمۃ کو ان کے ایک شامی استاذ نے معمولی سی بات پر جو غلط فہمی پر مبنی تھی بہت زیادہ مارا تھا لیکن اس وقت اور اس کے بعد مولانا کے دل میں ذرا بھی تکدر نہ ہوا، آج عرب اور عجم میں حضرت مولانا کا جو مقام ہے اور اللہ پاک دین کی جو خدمت ان سے لیا ہے دنیا اس کو دیکھ چکی ہے، بزرگوں نے فرمایا کہ استاذ کے سامنے ادب سے بیٹھو اس کے برابر نہ بیٹھو وہ کہے تب بھی نہ بیٹھو، جب نہ بیٹھنے پر اس کو صدمہ ہو تب مضائقہ نہیں، اس کے سامنے ادب سے گفتگو کرو، لم (کیوں) لانسلم (ہم نہیں تسلیم کرتے) نہ کہو، ایک بزرگ نے فرمایا: اپنے اساتذہ کو برا نہ کہو ورنہ تمہارے تلامذہ تمہیں برا کہیں گے، استاذ کا یہ بھی حق ہے کہ فراغت کے بعد بھی ان سے ملاقات کرتا رہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں اس کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھایا اگر وہ چاہے تو مجھے بیچ دے اور اگر چاہے تو آزاد کر دے یا غلام رکھے، جو شخص اپنے استاذ کی تکلیف کا باعث ہو وہ علم کی برکت سے محروم

رہے گا، اور برابر کوششوں کے باوجود علم کی دولت سے منتفع نہیں ہوسکتا۔

ایک شاعر لکھتا ہے۔

رایت أحق الحق حق المعلم وأوجبه حفظا على كل مسلم

لقد حق أن يهدى اليه كرامة لتعليم حرف واحد الف درهم

سب سے بڑا حق معلم کا ہے جس کی رعایت تمام مسلمانوں پر فرض ہے واقعی وہ شخص جس نے تم کو ایک لفظ سکھایا اس کا مستحق ہے کہ ہزار درہم اس کے لیے ہدیہ کئے جائیں بلکہ اس کے احسان کے مقابلہ میں تو ہزار درہم کی بھی کوئی حیثیت نہیں) استاذ کو کبھی ناراض نہ کرنا چاہیے اگر اس کی شان میں خدانخواستہ کوئی بے ادبی اور گستاخی ہوجائے تو فورا انتہائی عاجزی کے ساتھ معافی مانگ لے، اگر استاذ کا دل مکدر ہوگیا تو اس سے فیض حاصل نہیں کرسکتا، ایک مرتبہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کسی مرض کی وجہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اثنائے گفتگو میں ابراہیم بن طہمانؒ کا ذکر نکل آیا ان کا نام سنتے ہی امام احمدؒ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ یہ نازیبا بات ہوگی کہ بڑوں کا نام لیا جائے اور ہم ٹیک لگا کر بیٹھے رہیں۔

اسلام میں تعلیم وتربیت کا مقام:

تعلیم وتربیت کا عمل گذشتہ ادوار میں ایک عبادت کی حیثیت رکھتا تھا، اور لوگ اس کو فضیلت وسعادت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور شریفانہ انسانی تعلقات کو مستحکم کرنے اور انسان کو اللہ تعالی سے جوڑنے کا ایک مضبوط ذریعہ قرار دیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ ان عظیم شخصیتوں کے ذکر سے معمور ہے اور دنیا کی علمی تاریخ انہیں عظیم شخصیتوں کے فیض بے پایاں کا نتیجہ ہے اور انسانی زندگی کو بامقصد بنانے میں ان کا کردار بہت عظیم ہے، اگر ماضی کی طرف نگاہ ڈالیں تو ہمیں انسانی زندگی میں مقصدیت کی روح پھونکنے اور نہایت وسیع پیمانے پر خیر کو پھیلانے اور شر کو مٹانے کی مخلصانہ کوششیں نہایت واضح طور پر نظر آئیں گی، جہاں مال وجاہ اور منصب وکرسی کا کوئی گذر نہیں تھا اور تعلیم وتربیت کے پیشہ کو اختیار کرنے اور مثالی سیرت وکردار کے اعلی ترین مقام تک پہونچنے کا حقیقی سبب یہی حصول علم کا سچا جذبہ تھا، اسی فطری بنیاد پر تعلیم وتربیت کا نظام وضع کیا جاتا تھا

اور اس میں ہر چیز کی رعایت رکھی جاتی تھی، ماحول اور معاشرتی فضا قوموں اور جماعتوں کے عقلی اور فکری معیار کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا اسی بناء پر تعلیم وتربیت کا حقیقی مقصد ماہرین تعلیم کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے پایا اور نصاب تعلیم کا نمایاں وصف مقصد کی روح ہوا کرتی تھی، اور دنیا میں بسنے والے تمام قوموں اور احساس ذمہ داری سے مزین انسانی معاشرے میں رہنے والے تمام عناصر یہاں تک کہ بڑی بڑی حکومتوں کا یہی مقصد ہوا کرتا تھا، اور یہی وہ ذریعہ تھا جس سے بین الاقوامی تعلقات مضبوط ہوتے تھے خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں، سیاسی، ثقافتی، تمدنی اور عالمی پیمانے پر تمام قوموں کے درمیان اعتماد واعتبار کی فضا قائم ہوکرتی تھی، اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ تعلیم وثقافت کے وسائل اور اس کے نظام کو ناپسندیدہ جذبات کے ابھارنے اور انتقام کی پیاس بجھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہو اور نہ کبھی تجارتی سامان کی طرح اس کو بیچنے اور مارکیٹنگ کے لئے استعمال کیا گیا۔

ہماری مذہبی تعلیم کے یہ ادارے جن کو ممتاز علماء دین اور دین وملت کی صحیح فکر رکھنے والے مسلم دانشوروں نے قائم کیا اور چلا رہے ہیں اور ان سے مذہب اسلام کی حفاظت انجام پارہی ہے ان کو مسلمانوں کے بدخواہوں کی طرف سے بار بار چیلنج کیا جارہا ہے، اگر ہم اس چیلنج کے خطرہ کو نہیں سمجھ سکیں گے تو ہم بحیثیت مسلمان ختم ہوجائیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ ہماری ان درسگاہوں کو جو مسلمان کی زندگیوں میں دینی حیثیت کا کام کررہی ہے، اہمیت کی نظر سے دیکھا جائے، مسلمانوں کے لئے موجودہ دور مختلف قسم کی اہمیتوں اور تقاضوں کا دور بن گیا، اس وقت عالمی پیمانے پر اس امت اسلامیہ کو بے اثر بلکہ بے نام ونشان کردینے کی کوشش ہورہی ہے، جگہ جگہ ان کی بقا اور دین کے ساتھ ان کے حق تعلیم کو ختم کردینے کی سازشیں چل رہی ہیں، کہیں علمی وفکری میدان میں، کہیں تمدنی وتاریخی میدان میں، کہیں سیاسی وسماجی میدان میں ایسے ایسے فتنے کھڑے کیے جارہے ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ کے لئے ممتاز اہل قلم واعلی صلاحیت کے علماء وفضلاء تیار کرنے کا کام نہ کیا گیا تو امت کے وجود کو خطرہ پیش آسکتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم وتعلیم کی اشاعت وعمومیت کی تحریک اور اس کی سعی وجد وجہد تقریبا ہر ملک میں اور تاریخ کے ہر دور میں، کسی نہ کسی درجہ میں خلوص وایثار

،سادگی اور جفاکشی اور علمی نمونہ وکردار کے ساتھ متصف ومربوط رہی ہے اور اسی میں ناسازگار حالات، سلطنت ومعاشرہ کے انقلابات، جابر حکومتوں کی موجودگی، طبعی مرغوبات ،معاشی ضروریات اور ہر زمانہ میں معیار زندگی بے رحم روائی کے باوجود تعلیم وثقافت (کلچر) کا ہر دور میں کام ہوتا رہا، نوشت وخواند کا دائرہ وسعت اور ترقی اختیار کرتا رہا اور زندگی اور مذہب کی بہت سی حقیقتیں اور صداقتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں، اس تاریخی حقیقت کے امتحان وتصدیق کے لئے تعلیمی خدمت کا ہر ملک اور ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں خلوص وایثار اور سادگی اور جفاکشی سے ربط وتعلق اور باہمی رفاقت رہی ہے، روایتی وعرفی (Traditional) تاریخوں کے بجائے جو سرکار دربار، جنگوں اور انقلابات سلطنت اور (سیاسی وانتظامی طور پر) سربرآوردہ اشخاص سے تعلق رکھتی اور انہیں کے گرد گھومتی ہیں، ماہرین علم وفن اور سماجی خدمت گاروں اور مذہبی پیشواؤں کے سوانح حیات اور تذکرے دیکھنے کی ضرورت ہے، ہزاروں برس سے انسانی نسلوں میں (زبان وتہذیب اور مذہب وعقائد کے اختلاف کے باوجود) جو احساسات وتاثرات نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں، ان میں ایک پیشہ ور (Proffessional) اور غیر پیشہ ور (Non-proffessional) میں فرق وامتیاز ہے، آخر الذکر (غیر پیشہ ور) کے ساتھ ہمیشہ احترام واعتراف اور عقیدت ومحبت کا تاثر اور تقلید واتباع کا (خواہ اس پر عمل نہ ہوسکے) جذبہ اور شوق وابستہ رہا ہے، فطرت انسانی کے اس دائمی تاثر وردعمل اور مسلمہ حقیقت کے پیش نظر، ہر دور اور ہر امت میں مبعوث کئے جانے والے پیغمبر نے اپنی قوم میں ہدایت وتبلیغ کا کام شروع کرتے وقت اس کی وضاحت ضروری سمجھی کہ وہ کسی دنیاوی منفعت، مال ودولت اور معاوضہ واجرت کا طالب نہیں، قرآن مجید کے سورہ شعراء میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام میں سے کسی کے تذکرہ میں بھی ان کے اس بیان اور اطمینان دہانی کو نظر انداز نہیں کیا گیا کہ میں تم سے کسی دنیاوی منفعت کا امیدوار نہیں ہر ایک کے تذکرہ میں اس کا بیان واعلان نقل کیا گیا ہے کہ: **وما أسئلكم عليه من أجر ان اجرى الا على رب العلمين** ، میں تم سے (اس دعوت ونصیحت اور محنت وسعی پر) کسی معاوضہ ومنفعت کا طالب نہیں، میرا

معاوضہ وانعام رب العلمین کے ذمہ ہے۔

پھر جب خدا کا آخری دین اسلام دنیا میں آیا تو اس نے صحیح تعلیم کے کام اعلی درجہ کی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور اس کو انبیاء کی نیابت کا منصب قرار دیا، اس کے نتیجہ میں پورے عالم اسلام میں آزاد دینی تعلیم کا نظام جاری ہوا اور دینی مدارس ومکاتب کی شکل میں مدرسے اور مکاتب قائم ہوئے اور بالعموم مسجدیں قرآن مجید اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا مرکز بن گئیں، سلاطین وقت کی علمی قدردانی وسرپرستی اور شوق وکوشش کے باوجود اکثر یہ مدارس اور تعلیمی مراکز آزاد رہے اور ان کا براہ راست عوام سے ربط وتعلق رہا اور عوام سے ربط وتعلق کا گہرا نفسیاتی اثر اور فائدہ ظہور میں آیا جو بالکل قدرتی ومنطقی ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی ادارہ یا تحریک کی امداد میں براہ راست حصہ لیتا ہے (خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو) تو اس کو اس سے ایک نفسیاتی اور جذباتی تعلق اور لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ مستحکم اور طویل المیعاد اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور شاہان وقت کی فیاضی اور بعض اوقات دینداری کے باوجود، اس تحتی براعظم کے مسلمانوں کی اسلام سے ارادی وشعوری وابستگی، بقدر ضرورت دینی معلومات اور دینی احکام پر عمل کرنے کا جذبہ، اس آزاد دینی نظام تعلیم اور ان ہی آزاد مدارس کے ایثار پیشہ اور مخلص فضلاء کی سعی وجہد کا نتیجہ ہے، جس میں مسلم سلطنتوں اور فرماں رواؤں کا تقریبا کچھ حصہ نہیں، تاریخ وحقائق کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک نہ صرف اس برصغیر کے مسلمانوں کا بلکہ بیشتر یا تمام حتی کہ عرب ممالک تک کے مسلمانوں کا دین وشریعت سے ربط وتعلق وران کی دینی باخبری اور اسلامی ثقافت وتہذیب سے نہ صرف واقف ہونا، بلکہ اس کا حامل اور پر جوش حامی ہونا، ان ہی ایثار پیشہ، رضا کار اور کسی حد تک زاہد ومتوکل فضلائے مدارس اور ناشرین علم دین کا رہین منت ہے۔

ان مدارس کے اساتذہ وفضلاء میں سے متعدد اگرچہ اپنے فن کے ماہر اور یگانہ روزگار عالم ہوتے تھے، لیکن وہ پورے اعتماد وافتخار کے ساتھ یہ کہنے کے اہل تھے کہ

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں — غلام طغرل وسنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

تعلیم وتربیت اور مفکرین اسلام:

ذیل میں مختلف مفکرین اسلام کے اقوال وآراء اختصار سے دیے جارہے ہیں:

علم پیغمبروں کے میراث ہے اور مال کفار، فرعون وقارون وغیرہ کی (حضرت ابوبکرؓ)

طالب دنیا کو علم سکھانا ڈاکو کے ہاتھ تلوار فروخت کرنا ہے۔ (حضرت عمرؓ)

ضائع ہے وہ علم ہے جس پر عمل نہ کیا جائے۔ (حضرت عثمانؓ)

شرافت عقل وادب سے ہے نہ کہ مال ونسب سے۔ (حضرت علیؓ)

میں نے پوچھنے والی زبان اور سوچنے والے دماغ سے علم حاصل کیا۔ (حضرت ابن عباسؓ)

جب میں کوئی بات سمجھ لیتا اور اس کی باریکی اور حکمت سے واقف ہوجاتا تو الحمدللہ کہا کرتا اس لیے کہ میرے علم میں ترقی ہوگئی۔ (امام ابوحنیفہؒ)

تنہائی میں نصیحت کرنا اور سمجھانا شرافت کی دلیل اور اصلاح کی ضامن ہے۔ (امام شافعیؒ)

میں نے علم اس طرح حاصل کیا کہ دوسروں کے استفادہ سے باز نہیں رہا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ (امام ابویوسفؒ)

ہمارا یہ کام (علمی مشغلہ) بچپن سے موت تک ہے، جو شخص اس کو ایک گھڑی بھر بھی چھوڑنا چاہے اس کو وہ گھڑی ہی چھوڑ دے۔ (یعنی مرجائے تو بہتر ہے) (امام محمدؒ)

خدا کی قسم مجھ کو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس ہوتا ہے کہ کیوں کہ فرصت وقت بہت عزیز چیز ہے۔ (امام رازیؒ)

اساتذہ مبتدیوں کے لیے چھوٹی چھوٹی عام فہم اور ایسی کتابیں تجویز کیا کرتے تھے جن میں وہ باتیں ہوتی تھیں جن کا انسان کو اکثر اتفاق پڑتا رہتا ہے۔ (امام شرف الدین عقیلیؒ)

سبق کی مقدار شروع میں اس قدر ہونی چاہیے جو صرف دو مرتبہ کہہ لینے سے یاد ہوجائے۔ (امام زرنجیؒ)

احنف بن قیسؒ کی حضرت امیر معاویہؓ کو نصیحت:

بچے ہمارے ستون ہیں جن سے ہماری پیٹھ سہارا لیتی ہے، وہ ہمارے دلوں کے مرغوب پھل ہیں، وہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، انہیں کو لیکر ہم دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں، وہی ہمارے بعد ہماری جگہ لیتے ہیں، پس تجھے چاہیے کہ بچوں کے لیے نرم وملائم زمین بن جا، اگر وہ تجھ سے مانگیں تو انہیں دے وہ تیری خوشنودی چاہتے ہیں تو ان سے خوش رہ، انہیں اپنی محبت سے محروم نہ رکھ ورنہ وہ تیرے قریب سے بھڑکیں گے، تیری زندگی سے کھٹکیں گے اور تیری موت کی آرزو کریں گے۔

دوران تعلیم میں طلبہ کو مارنا پیٹنا نامناسب ہے، خاص طور پر چھوٹی عمر کے بچوں پر تو بالکل سختی نہیں کرنی چاہیے، جو شخص بچوں پر سختی کرتا ہے وہ ان کے دل کی خوشی کو چھین لیتا ہے، انہیں نکما اور ناکارہ بنادیتا ہے انہیں دروغ گو اور بد باطن کردیتا ہے، ان کے اندر ریاکاری اور نفاق کے جراثیم پلنے لگتے ہیں اور وہ ایسی باتیں ظاہر کرنے لگتے ہیں جو ان کے باطن کے خلاف ہوتی ہیں کیوں کہ اگر ایسا نہ کریں تو قہر وغضب کا شکار بنیں، وہ مکر وفریب کے عادی بن جاتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا پھر یہی عادات اور طور طریقے ان کی سیرت وکردار کے جز بن جاتے ہیں، پس معلم کو چاہیے کہ اپنے شاگرد پر اور باپ اپنے بیٹے پر قہر واستبداد کا مظاہرہ نہ کریں اور جور وستم کے بل پر تربیت نہ کریں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) بچے کی تعلیم وتربیت ایک نہایت اہم فریضہ ہے، وہ والدین کے پاس امانت ہے، اس کا قلب ایک جوہر نفیس، سادہ، ہر نقش وصورت سے خالی، ہر ایک نقش کے قابل ہے جس طرف مائل کرو اس طرف میلان کے لائق ہوتا ہے، مثلاً اگر خیر کی تعلیم پائے اور اس کا عادی بنایا جائے تو بڑا ہوکر بھی ایسا ہی رہے گا اور فلاح دارین سے بہرہ ور ہوگا اور اس اجر میں والدین، اساتذہ اور مربی سب شریک رہیں گے اور اگر شر کا عادی بنے گا اور جانوروں کی طرح بے غور وپرداخت چھوڑ دیا جائے گا تو تباہ وبرباد ہوجائے گا اور اس کا وبال اس کے

مربی پر ہوگا۔

(۲) بچہ جب کوئی عمدہ کام کرے تو اس کو کچھ انعام دینا چاہیے تا کہ وہ خوش ہو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرنی چاہیے اور اگر کبھی کوئی غلطی سرزد ہو تو اس سے چشم پوشی کرنی چاہیے اور اس کا پردہ نہیں کھولنا چاہیے خاص کر ایسی صورت میں جب خود بچہ اس کام کو چھپائے اور اسے پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کرے کیوں کہ اگر اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ جانے سے کچھ نہ ہوا تو آئندہ برائیوں پر جری ہو جائے گا اور بھید کھلنے کی پرواہ نہ رہے گی، دوبارہ غلطی سرزد ہو تو تنہائی میں اس پر عتاب کرنا چاہیے اور تاکید سے کہنا چاہیے کہ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، اگر پھر کرو گے تو سب کے سامنے ذلیل کیے جاؤ گے۔

(۳) بچے کو ہر وقت ڈانٹنا ڈپٹنا نہیں چاہیے کیوں کہ اس سے وہ لعنت ملامت کا خوگر ہو جاتا ہے اور مذموم حرکات کھلم کھلا کرنے لگتا ہے اور نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیتا۔

(۴) بچے کو مکتب میں بھیج کر قرآن، حدیث اور صلحاء کی حکایتیں سکھانی چاہئیں تا کہ صالحین کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو۔

(۵) نشست و برخاست کے آداب سکھانے چاہیں، بہت زیادہ بولنے سے منع کرنا چاہیے۔

(۶) اس کا عادی بنانا چاہیے کہ سب سے پہلے نہ بولے، دوسرا شخص کوئی بات کہے تو غور سے سنے، اپنے بڑے کی اٹھ کر تعظیم کرے اور اس کے لیے جگہ خالی کر دے۔

(۷) مکتب سے آنے کے بعد بچے کو اچھے کھیل کا موقع دینا چاہیے تا کہ مکتب کی مشقت سے راحت ملے لیکن کھیل ایسا نہ ہو جو تھکا کر چور چور کر دے، اگر کھیل سے محروم کر دیا جائے، اور ہمیشہ تعلیم میں لگائے رکھا جائے تو بچے کا دل مرجاتا ہے اس کی ذکاوت ماند پڑ جاتی ہے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ تعلیم سے بھاگنے اور خلاصی و فرار کی صورتیں سوچنے لگتا ہے۔

(۸) یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ماں باپ اور معلم و مربی کی اطاعت کا عادی بنایا جائے اور ان اشخاص کا ادب و احترام کرنا سکھایا جائے جو عمر میں اس سے بڑے ہوں خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے۔

(۹) حاصل کلام یہ ہے کہ تربیت ابتدا میں بہت ضروری ہے کیوں کہ بچپن میں اس کا جوہر قابلی ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہے، خیر و شر دونوں سیکھ سکتا ہے اور اس کا اختیار ماں باپ کو ہے جس طرف چاہیں بآسانی مائل ہو سکتا ہے۔

(۱۰) اگر ایک طبیب تمام بیماریوں کا ایک ہی نسخہ لکھے اور ایک ہی دوا سے علاج کرے تو اکثر ہلاکت کا باعث ہوگا، بالکل یہی حال معلم و مربی کا ہے اگر وہ اپنے زیر تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا تو انہیں برباد کر دے گا، ان کے قلوب پر موت طاری کر دے گا، معلم و مربی کا فرض ہے کہ زیر تربیت لڑکوں میں سے ہر ایک کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق ان کے لیے راستہ تجویز کرے اور ان کے لیے وہی ریاضت تجویز کرے جس کے وہ متحمل ہو سکیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ:

(۱) اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں، دنیا میں اگر اس وقت اسلام کی بقا کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں لیکن ساتھ ہی ان مدارس میں ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت ہدف ملامت بھی بنتی ہے اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح و غایت ہے یعنی عمل بالدین وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور لوگ علوم دینیہ سے متوحش و نفور ہو جاتے ہیں تو اس طرح یہ جماعت علم گویا یصدون عن سبیل الله (خدا کی راہ سے روکنے) کا سبب بن جاتی ہے،

(۲) اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا اور مدرس بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہ ہوا، دریافت کر لیا ورنہ آگے چل پڑے، یہ طریقہ مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لیے بھی غیر نافع ہے اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے بلا ضرورت ان کی امداد نہ کی جائے خود ان ہی سے مطلب کی تقریر کرائی جائے، نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرت امثلہ سے مشق کرائی جائے۔

(۳) مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس بیس بیس لڑکوں پر ایک معمر نگراں

مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے، نگراں سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں، ان کے نام جو خطوط آئیں وہ بھی دیکھ کر دے، ان کے سر منڈاتا رہے، پان نہ کھانے دے، لباس سادہ ہو، نماز و جماعت میں ان کی حاضری کی فکر رکھے، تفریح یا کسی ضرورت سے بازار وغیرہ جائیں تو ان کے ساتھ رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ:

(۱) امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا، انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے، اس کو سمع، بصر اور فواد تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی نسبت کمتر دی گئی ہیں، اس لیے وہ اس بات کا اہل ہوا ہے کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے، اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری نوع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔

(۲) سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے، بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتیجہ اخذ کرنا ہے، یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے، جو انسان ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں، انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے، ان کا کام پیچھے چلنا پڑتا ہے، بخلاف ان کے جو ان تینوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب رہتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، رہنمائی اور پیشوائی ان ہی کے حصے میں آتی ہے۔

(۳) جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے اور کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اس کی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے، زمین پر اس کا تسلط ہوتا ہے، رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں، حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں اس لیے

انسانی حیات اجتماعی کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور اس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویہ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے، اب یہ ظاہر ہے وہ گروہ جس کو یہ تسلط دینا اور اس کے معاملات پر حاصل ہے خدا سے بھرا ہوا ہو تو اس کے حیطہ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف سے پھرنا چاہتا ہو۔

(۴) انقلاب امامت کے لیے انقلاب تعلیم ناگزیر ہے۔

(۵) ناخدا شناس امامت میں رہ کر خدا شناسی و خدا پرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اس کے عین ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

(۶) جو نظام تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے اس میں ہرگز یہ طاقت نہیں کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لیے آپ کو تیار کر سکے۔

(۷) جو نظام تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویہ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس ائمہ کی ترتیب اور ان کا زاویہ نظر ہے اور جو اس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو ائمہ ضلال نے بنائی ہے وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔

(۸) اصلاح تعلیم کا لائحہ عمل کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے، یہ بھی امامت میں انقلاب کرنے کے لیے آپ کو تیار نہیں کر سکتا، اس لیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت تک مدون و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطہ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصّبات اور اہواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطہ نظر سے بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاذ کے بس کی۔

اورنگ زیبؒ کے تعلیمی رجحانات:

اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے بعد ایک مرتبہ ان کا ایک استاذ و عالم کسی منصب کی

آرزو میں اس کے پاس آیا تو اورنگ زیب نے تخلیہ میں بلا کر ان کے سامنے ایک طویل تقریر کی اور کہا کہ:

ملاجی! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو دربار کے اول درجے کے امراء میں داخل کرلوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا، پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا اور اب شاہ انگلستان ہے، فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کی نسبت آپ نے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہ ہندوستان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں ....آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی وتنزلی کے اسباب بتاتے.......خیر دنیا کی تاریخ سے تو پورے طور پر آگاہ کرنا تو درکنار آپ نے تو میرے آباء واجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے، آپ نے یہ خیال نہیں کیا کہ ایک شہزادے کے لئے کونسے مضامین درکار ہیں؟ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف ونحو کی بڑی مہارت ہونی چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا ایک فقیہ کو ہوتی ہے، اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کو سیکھنے کی خشک، بے فائدہ اور لامتناہی کوششوں میں صرف کردیا، آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے، یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنی دل پسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کردیے، جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم وفن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں ایسی چند دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کرسکتا تھا جن سے روشن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں، اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی وسائل کا طلبگار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں پڑھاتے جن سے روح کو عظمت حاصل ہوتی ہے یا وہ اصول بتاتے جن سے حوادث زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا

مضبوط ہوجاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرسکتے ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے، یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کردیتے یا مجھے دنیا کا اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا حال بتادیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔

(مسلمانوں کا عروج وزوال: ۳۱۷ر)

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کے تاثرات

(سابق سکریٹری جمعیۃ علماء ہند)

معلم کی خدمت کی اہمیت:

آپ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں ممکن ہے اس کو آپ معمولی کام سمجھتے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ جن مسلمانوں نے آپ کے متعلق یہ خدمت کی ہے وہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے ہوں لیکن آپ یقین کیجئے کہ مفاد ملت اور جماعتی نقطۂ نظر سے یہ بہت زیادہ اہم، بہت زیادہ قابل قدر اور بہت زیادہ مستحق توجہ ہے جو خدمت آپ انجام دے رہے ہیں وہ ایسی عظیم الشان خدمت ہے جو تعمیر ملت کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، آپ بچہ کے سادہ دماغ میں اسلام کا پودا لگا رہے ہیں وہ جس قدر بڑھے گا اور ترقی کرے گا آپ کا بویا ہوا بیج ہوگا، بچہ کے دماغ کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے اس کے ماں باپ اور مربی حضرات نے اس کو آپ کے حوالہ کردیا ہے اب تمام ذمہ داری آپ پر ہے، اگر آپ اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دیں گے تو یہ بچہ آپ کے خزانہ اعمال کا ایک قیمتی موتی ہوگا، یہ بچہ اپنی آخری عمر تک اس تعلیم پر جو کچھ عمل کریگا اس کا ثواب جیسا اس کو ملے گا آپ کو بھی ملتا رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے الدال علی الخیر کفاعله، اچھی بات کا راستہ بتانے والے کو وہی ثواب ملے گا جو عمل کرنے والے کو ملتا ہے۔

آپ کا خطاب:

ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کی بستی یا آپ کے گاؤں میں آپ کو کیا خطاب دیا جاتا ہے البتہ ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ اگر آپ اپنا فرض محنت اور سلیقہ سے انجام دیتے رہے ہیں، یعنی اگر آپ یہ کوشش کررہے کہ بچہ جیسے پڑھنا لکھنا سیکھے اور حرفوں کے نقوش اور ان کی مختلف شکلیں جس طرح اس کے دماغ میں پیوست ہوا یسے ہی اللہ رسول کی باتیں اس کے دل و دماغ میں جم جائیں اس کی عادات اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں اور آپ کے جذبات ورجحانات پر اسلامی عقائد وروایات کی چھاپ ہو تو ہم آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ سید الثقلین، خاتم الانبیاء والمرسلین، رحمہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو معلم الخیر کا خطاب عطا فرمایا ہے اور ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ترجمان رسالت نے آپ کو یہ خوشخبری دی ہے کہ اللہ تعالی کی رحمتیں آپ کے لئے پھیلی ہوئی ہیں اللہ کے فرشتے اور زمین وآسمان کی ہر ایک شے یہاں تک بلوں کی چیونٹیاں اور سمندروں کی مچھلیاں آپ کے لئے دعاء خیر کررہی ہیں **قال النبی صلی اللہ علیه: وسلم ان اللہ وملئکته واهل السموت والارضین حتی النملة فی جحرها وحتی الحوت لیصلون علی معلم الناس** (ترمذی شریف) جب کہ اچھی تعلیم نہ صرف اس بچہ کے لئے بلکہ تمام انسانوں کے علاوہ فضاء آسمان اور بحروں کی مخلوق کے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ ہے تو حضرات معلمین کی تعلیمی جدوجہد نہ صرف نوع انسانی کے لئے بلکہ تمام مخلوق کے لئے ایک اساسی اور بنیادی خدمت ہے۔

کوتاہی کا وبال:

لیکن جو کام جس درجہ اہم اور ضروری ہوتا ہے اور جس کی منفعت عام اور ہمہ گیر ہوتی ہے اس کی ادائیگی میں اگر سستی اور کوتاہی کی جائے تو اس کا وبال بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، لہذا اس عظیم الشان بنیادی خدمت میں اگر آپ خدانخواستہ لاپرواہی برتتے ہیں اور اس کو محض خانہ پری کے طور پر انجام دیتے ہیں تا کہ آپ کی تنخواہ واجب ہوجائے تو ظاہر

ہے کہ آپ نہ صرف اس بچہ کے حق میں خیانت کررہے ہیں بلکہ آپ پوری ملت نوع انسان کے حق میں خیانت کررہے ہیں بلکہ ساری مخلوق کی نظر میں آپ مجرم بن رہے ہیں اور بہت بڑی تباہی کا بار آپ اپنے سر لے رہے ہیں۔

مقصود کلام:

اس تمام حقیقت کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فرض کو پوری طرح محسوس کریں اور اس خدمت کو جو ملت کی بنیادی خدمت ہے اس توجہ اور اس جانفشانی اور محنت سے انجام دیں جو اس عظیم الشان خدمت کے لئے ضروری ہے اس پر آشوب دور میں جب کہ لامذہبیت کو فیشن سمجھا جارہا ہے اور ہر طرف سے مذہب کی مخالفت کے لئے محاذ قائم کئے جارہے ہیں مذہبی تعلیم کے راستے روکے جارہے ہیں اور اس کے ذرائع بند کئے جارہے ہیں آپ پر لازم ہے کہ بچہ کا جو وقت آپ کو ملا ہے اس کو غنیمت سمجھیں اور ایسا طرز اختیار کریں کہ تھوڑے سے وقت میں بچہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکے اور جس طرح مذہب کو ختم کرنے کی جدوجہد پوری سرگرمی سے جاری ہے آپ کی یہ کوشش پوری مستعدی سے ہونی چاہئے کہ اس تھوڑے سے وقت میں آپ بچے کو ایسے رنگ میں رنگ دیں کہ کسی طوفان کی شدید سے شدید بارش بھی اس رنگ کو نہ اتار سکے۔

علامہ اقبالؒ

مقصود ہو اگر تربیت لعل بدخشاں — بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
سیرت فرزند ہا ازامہات — جوہر صدق وصفا از امہات

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

شیخ مکتب ہے اک عمارت اگر — جس کی صنعت ہے روح انسانی
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط ونظام
از رموز جزوکل آگہ بود — درجہاں قائم بامر اللہ بود

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ وبیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق ومحبت کے لئے علم وہنر موت

وہ علم کی بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیات کلیم ومشاہدات حکیم

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مطلوبہ نظام تعلیم کی خصوصیات:

(۱) دینی ودنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔

(۲) علوم کو دینی ودنیوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دینا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے اور یہ تصورات بنیادی طور پر غیر اسلامی ہیں، اسلام جن چیزوں کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا کی یہ اللہ کی سلطنت ہے اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو اس چیز کا نام دین ہے اس تصور دین کا اقتضا یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم بنا دیا جائے۔

(۳) ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطہ نظر طالب علم کے سامنے آنے ہی نہیں دینا چاہئے، البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطہ نظر سے ہو مگر اس کے مخالف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید وتنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیا جائے کہ یہ ضالین اور مغضوب علیھم کے نظریات ہیں۔

(۴) ہر طالب علم کو مجموعہ علم اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو مولانا اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتوی کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ

اقتصادی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے، انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے اور اگر تمام علوم میں محض معمولی شد وبد اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبہ علم میں کامل نہیں ہو سکتا، اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اس کو خالص اسلامی نقطہ نظر سے دے دی جائیں - اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہیے، زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، عملی زندگی کے متعلق وہ معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقے پر برتنے کے لئے تیار ہو جائے، اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے، عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تا کہ معلومات کے اس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے، اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبہ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔

(۵) اس نئے نظام میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندوستان میں دی جا رہی ہے بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی وعمل ہوگا، یعنی یہ کہ ان سب کو مسلک خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لئے جہاد کبیر کرنا ہے، یہ مقصد اس نظام کی ہر چیز میں اس طرح کام کرے جس طرح انسانی جسم کے ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اس کی روح کام کرتی ہے، طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات اور ان کے درس وتدریس اور مطالعہ وتحقیق کے تمام مشاغل میں اس مقصد کی کارفرمائی ہو، اسی کے مطابق ان کی سیرت وکردار کی تعمیر کی جائے، اسی پر ان کے اخلاق ڈھالے جائیں اور تمام ماحول ایسا بنایا جائے کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم

اللہ تعالی نے اپنے حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو انسانیت پر اپنا بہت بڑا احسان قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ آل عمران ۱۶۴ میں اللہ تعالی نے اس کا ذکر فرمایا ہے، حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اسے دل نشین انداز میں سمجھا رہے ہیں۔

محسن انسانیت سرور دوعالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم اور مثالی معلم بن کر تشریف لائے تھے، ایسے معلم جن کی تعلیم وتربیت نے صرف تیئیس سال کی مختصر مدت میں نہ صرف پورے جزیرہ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی بلکہ پوری دنیا کے لئے رشد وہدایت کی وہ ابدی قندیلیں بھی روشن کر دیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کو عدل وانصاف، امن وسکون اور عافیت واطمینان کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال کی مختصر سی مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اس کی برق رفتاری اور اس کے ہمہ گیر اثرات نے ان لوگوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن کے سخت مخالف رہے تھے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ تیئیس سال کی مختصر مدت میں صحرائے عرب کے جو وحشی، علم ومعرفت اور تہذیب وتمدن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم وحکمت اور تہذیب وشائستگی کے چراغ روشن کرنے لگے، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے، جہاں ہر طرف قتل وغارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن وآشتی کے گلاب کھل اٹھے جہاں ظلم وبربریت کا دور دورہ تھا وہاں عدل وانصاف کی شمعیں روشن ہونے لگیں، جہاں پتھر کے بتوں کو سجدے کئے جا رہے تھے وہاں توحید کا پرچم لہرانے لگا اور بالآخر عرب ہی کے صحرانشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا میں ذلیل وخوار تھے وہ ایران وروم کی عظیم

سلطنتوں کے وارث بن گئے اور ساری دنیا ان کے عدل وانصاف، ان کی رحم دلی اور ان کی شرافت نفسانی کے گن گانے لگی، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا جو سو فیصد نتیجہ دنیا نے دیکھا ہے، تاریخ انسانیت کے کسی اور معلم کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی، آج ہم اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کی وہ کیا بنیادی خصوصیات تھیں جنہوں نے دنیا بھر میں یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا، موضوع تو بڑا طویل ہے اور تفصیل کا محتاج ہے، حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز وتربیت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کرنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے لیکن میں یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تربیت کی صرف دو خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنی بصیرت اور مطالعے کی حد تک مجھے سب سے زیادہ بنیادی معلوم ہوتی ہیں، ان میں پہلی خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ورحم دلی، دل سوزی وخیر خواہی اور نرم خوئی ہے، چناں چہ قرآن کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کا ذکر فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا بہت بڑا سبب قرار دیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: فبما رحمة من الله لنت لهم ولوكنت فظاغليظ القلب لاانفضوامن حولك

پس یہ اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بناء پر آپ لوگوں کے لئے نرم خو ہو گئے اور اگر آپ درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

جس شخص نے بھی سیرت طیبہ کا کچھ مطالعہ کیا وہ جانتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، آپ کو طرح طرح سے اذیت پہنچائی اور آپ پر مصائب وآلام کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غضب ناک ہونے کے بجائے ان پر ترس کھاتے تھے کہ یہ لوگ کیسی سنگین گم راہی میں مبتلا ہیں اور ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حق بات ان کے دل

میں اتر جائے اور یہ ہدایت کے راستے پر آجائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے معلم نہ تھے کہ محض کوئی کتاب پڑھا کر یا درس دے کر فارغ بیٹھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا بل کہ اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زیر تربیت افراد کی زندگی کے ایک ایک شعبے میں دخیل تھے، ان کے ہر دکھ درد میں شریک اور ہر لمحے ان کی فلاح و بہبود کے لئے فکر مند رہتے تھے ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی وصف کے بارے میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم، بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جس پر تمہاری شفقت گراں گزرتی ہے اور جو تمہاری بھلائی کا بے حد حریص ہے اور مسلمانوں پر بے حد مہربان ہے۔

علامہ نور الدین ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسند احمد اور معجم طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آکر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے۔

ذرا تصور کیجئے کہ کیا فرمائش کی جارہی ہے.....؟ ایک ایسے گھناؤنے گناہ کو حلال قرار دینے کی فرمائش کی جارہی ہے جس کی قباحت وشناعت پر دنیا بھر کے مذاہب وادیان متفق ہیں اور یہ فرمائش کس سے کی جارہی ہے....؟ اس برگزیدہ ہستی سے جس کی عصمت وعفت کے آگے فرشتوں کے بھی سر جھک جھاتے ہیں، کوئی اور ہوتا تو اس نوجوان کو مار پیٹ کرتا یا کم از کم ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکلوا دیتا، لیکن یہ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جن کا کام صرف برائی پر خفگی کا اظہار کر کے پورا نہیں ہو جاتا تھا بل کہ اس برائی کے علاج کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس نوجوان کے خلاف بغض وغضب کے بجائے ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا ہوئے، اور اس پر ناراض ہونے کے بجائے اسے پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا، اپنے قریب بٹھایا، اس کے کندھے پر مشفقانہ ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجہ میں فرمایا: اچھا یہ بتاؤ! جو عمل تم کسی اجنبیہ خاتون کے ساتھ

کرنا چاہتے ہو اگر کوئی دوسرا شخص تمہاری ماں کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم اس کو گوارا کرلو گے....؟

نوجوان کے ذہن وفکر کے بند دریچے ایک ایک کر کے کھلنے لگے اس نے کہا نہیں یارسول اللہ!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے اچھا یہ بتاؤ اگر کوئی شخص تمہاری بہن کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کیا تم اس کو گوارا کرلو گے؟ نوجوان نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بات تمہیں اپنی بہن کے لئے گوارا نہیں دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے اسے پسند نہیں کرتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس نوجوان کو مثالیں دے دے کر سمجھاتے رہے اور آخر میں اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا بھی فرمائی: یااللہ! اس کے گناہ معاف فرمادیجئے اور اس کے قلب کو پاک کر دیجئے اور اس کی شرمگاہ کو عفت عطا فرمائیے، یہاں تک کہ جب وہ مجلس سے اٹھے تو اس گھناؤنے عمل سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو چکے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان پر غیظ وغضب کا اظہار کر کے اپنے مشتعل جذبات کی تسکین کر سکتے تھے لیکن اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نوجوان کی زندگی تباہ ہوتی نظر آرہی تھی اس لئے اسے سختی کی بجائے نرم خوئی سے سمجھایا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم خوئی، حکمت اور تدبر اور تحمل ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ نوجوان ہلاکت کے گڑھے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

کاش! آج کے مصلحین، اساتذہ اور واعظین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل پیرا ہو سکیں تو آج انہیں اپنے نوجوانوں کی بے راہ روی کی شکایت نہ رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تعلیم وتربیت کی دوسری اہم خصوصیت جسے میں اہمیت کے ساتھ اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں اور احقر کی نظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تربیت کی سب سے زیادہ مؤثر خصوصیت ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

متبعین کو جس جس بات کی تعلیم دی اس کا بذات خود عملی نمونہ بن کر دکھا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعظ ونصائح اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت صرف دوسروں کے لئے نہ تھیں بلکہ سب سے پہلے اپنی ذات کے لئے تھی، اللہ تعالی نے بہت سے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت وسہولت عطا فرمائی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخصت وسہولت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے تمام مسلمانوں کی صف میں رکھنا پسند فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز کی تلقین فرمائی تو خود اپنا عالم یہ تھا کہ دوسرے اگر پانچ وقت نماز پڑھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ وقت نماز ادا فرماتے تھے جن میں چاشت، اشراق اور تہجد کی نمازیں شامل ہیں، تہجد عام مسلمانوں کے لئے واجب نہ تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی، تہجد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ادا فرماتے تھے کہ کھڑے کھڑے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالی نے آپ کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف نہیں فرمادیں پھر آپ کو اتنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالی نے مجھ پر یہ کرم فرمایا ہے لیکن کیا میں اللہ تعالی کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو نماز باجماعت کی تعلیم دی تو خود بھی یہ عمل کر کے دکھا دیا کہ ساری زندگی نماز باجماعت کی جو پابندی فرمائی وہ تو اپنی جگہ ہے، مرض وفات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی جماعت کو نہیں چھوڑا بل کہ دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عام مسلمان اگر رمضان کے فرض روزے رکھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہ تھا، عام مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ صبح کو روزہ رکھ کر

غروب کے وقت افطار کرلیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی روز مسلسل اس طرح روزے رکھتے تھے کہ رات کے وقت میں بھی کوئی غذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ میں نہیں جاتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو زکوۃ دینے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تاکید فرمائی تو سب سے پہلے خود اپنی عملی زندگی میں اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا، عام مسلمانوں کو اپنے مال کا چالیسواں حصہ زکوۃ کے طور پر دینے کا حکم تھا اور اس سے زیادہ حسب توفیق خرچ کرنے کی تلقین کی جاتی تھی لیکن خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل تھا کہ اپنی فوری ضرورت کو نہایت سادہ طریقے سے پورا کرنے کے بعد اپنی ساری آمدنی ضرورت مند افراد میں تقسیم فرمادیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تک گوارہ نہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وقتی ضرورت سے زائد ایک دینار بھی گھر میں باقی رہے۔

ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور جلد ہی واپس آئے، صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا، مجھے نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، مجھے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آجائے اور وہ محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے۔

حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رنجیدہ گھر میں تشریف لائے میں نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا، ام سلمہؓ! کل جو سات دینار آئے تھے شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے، حد یہ ہے کہ مرض الوفات کی حالت میں جب بیماری کی تکلیف نے سخت بے چین کیا تھا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں، فوراً حکم دیتے ہیں کہ انہیں خیرات کردو کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔

عام مسلمانوں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ تھی کہ جوش میں آکر ساری پونجی خیرات کردینا مناسب نہیں بل کہ اپنی ضرورت کے مطابق مال اپنے پاس رکھ کر باقی کو اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرو لیکن مسلمانوں کو اس تعلیم کا عادی بنانے کے لئے خود آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کا یہ نمونہ پیش فرمایا کہ گھر میں کوئی نقدی باقی نہ چھوڑی تا کہ لوگ اس مثالی طرز عمل کو دیکھ کر کم از کم اس حد تک آسکیں جو اسلام کو عام مسلمانوں سے مطلوب ہے، چناں چہ انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عملی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالی کا یہ ارشاد نازل ہوا: **لن تنالوا البر حتی تنفقوا مماتحبون**

تم نیکی کا کام ہرگز اس وقت تک حاصل نہ کرسکو گے جب تک اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ تعالی کی راہ میں خرچ نہ کرو، تو صحابہ کرامؓ نے اس آیت پر عمل کرنے کے لئے مسابقت کا جو غیر معمولی مظاہرہ فرمایا وہ تاریخ انسانیت میں اپنی مثال آپ ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے پر تمام صحابہ کرامؓ نے اپنی پسندیدہ ترین اشیاء خیرات کردیں اور ایسی ایسی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کردیں جنہیں وہ سالہا سال سے حرز جان بنائے ہوئے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو زہد وقناعت کی تعلیم دی تو خود اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا، غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بعض صحابہؓ نے آپ سے بھوک کی شدت کی شکایت کی اور پیٹ سے کپڑا ہٹا کر دکھایا کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنے بطن مبارک سے کپڑا ہٹا کر دکھادیا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم دی تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھادیا اگر دوسرے مسلمان عام سپاہی کی حیثیت میں مدینہ طیبہ کے دفاع میں خندق کھودنے کی مشقت برداشت کررہے تھے تو ان کا امیر صلی اللہ علیہ وسلم صرف قیادت ونگرانی کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ بنفس نفیس کدال ہاتھ میں لے کر کھودنے میں شریک تھا۔

ایثار کی تعلیم ہر معلم اخلاق نے دی ہے لیکن عموما یہ تعلیم معلم کے الفاظ اور فلسفہ سے آگے نہیں بڑھتی اس کے برخلاف انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

زبان سے ایثار کے الفاظ کم استعمال کئے اور عمل سے اس کی تعلیم زیادہ دی، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحبزادی ہیں اور مرتبہ کے لحاظ سے صرف عرب کی نہیں دونوں جہاں کی قابل احترام شہزادی ہیں لیکن چکی پیستے پیستے ان کی ہتھیلیاں گھس گئی ہیں، وہ آکر درخواست کرتی ہیں کہ مجھے کوئی خادمہ دلوادی جائے لیکن مشفق باپ کی زبان سے جواب یہ ملتا ہے کہ فاطمہ! بدر (میں شہید ہونے والوں) کے یتیم (بچے) تم پر مقدم ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صبر وتحمل اور عفوودرگذر کا درس دیا تو خود اس پر عمل پیرا ہوکر دکھلا دیا ایک مرتبہ کسی شخص کا کچھ قرضہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا اس شخص نے آپ سے قرض کا مطالبہ کیا اور اس غرض کے لئے کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ساری دنیا جانتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقوق العباد کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام تھا، اور آپ اس شخص کے تقاضے کے بغیر ہی اس کا قرض ضرور چکاتے اس لئے اس شخص کے پاس اس تلخ کلامی کا کوئی جواز نہ تھا، چناچہ جب آپ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ نے اس شخص کا یہ گستاخانہ انداز دیکھا تو اسے گستاخی کا مزہ چکھانا چاہا لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تمام تر اشتعال انگیز اور تکلیف دہ رویے کو دیکھنے کے باوجود صحابہ کرامؓ سے فرماتے ہیں کہ **دعوہ فان لصاحب الحق مقالا** اسے رہنے دو، صاحب حق ہے، اور صاحب حق کو بات کہنے کی گنجائش ہے۔

اور عفوودرگذر کا جو معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا وہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے ظلم وستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا تھا انہیں لوگوں پر فتح پانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا تھا کہ: لاتثریب علیکم الیوم آج کے دن تم پر کچھ ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیم وتربیت جس نے دشمنوں تک کے دل جیتے، اور جس نے ایک وحشی قوم کو تہذیب وشائستگی کے بام عروج تک پہنچایا، اس کی سب سے بنیادی

خصوصیت یہ تھی کی وہ تعلیم محض ایک فکر اور فلسفہ نہیں تھی جسے خوبصورت الفاظ چڑھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کر دیا بلکہ وہ ایک متواتر اور پیہم عمل سے یہ عبارت تھی ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی ہر ادا مجسم تعلیم تھی چناں چہ اگر احادیث نبوی کا استقراء کر کے دیکھا جائے تو اس میں قولی احادیث کی تعداد کم ہے اور عملی احادیث کی تعداد زیادہ ہے۔

علامہ شیخ علی متقیؒ کی کتاب کنز العمال اب تک احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے جامع ذخیرہ سمجھی جاتی ہے،اس کتاب میں علامہ موصوفؒ نے ہر عنوان کے تحت قولی احادیث اور فعلی احادیث کو الگ الگ ذکر کیا ہے،اگر اس کتاب ہی کا جائزہ لیا جائے تو بیش تر عنوانات کے تحت قولی احادیث کا حصہ مختصر اور فعلی احادیث کا حصہ زیادہ نظر آتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے روئے زمین پر جو حسین و دل کش انقلاب برپا فرمایا اس میں زبانی تعلیم کا حصہ کم اور عملی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے۔

آج اگر ہم میں اساتذہ کی تعلیم ....واعظوں کے وعظ ....اور خطیبوں کی تقریریں .....متائج کے اعتبار سے بے جان اور اصلاح معاشرہ کے عظیم کام کے لئے بے اثر نظر آتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آج ہمارے معلموں ،واعظوں اور خطیبوں کے پاس صرف دل کش الفاظ اور خوشنما فلسفے تو ضرور ہیں لیکن ہماری عملی زندگی ان دل کش الفاظ اور خوش نما فلسفوں سے یک سر متضاد ہے اور ایسی تعلیم و تربیت نہ صرف یہ کوئی مفید اثر نہیں چھوڑتی بلکہ بسا اوقات اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب ایک شدید ذہنی کش مکش اور فکری انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے،استاذ کا بیان کیا ہوا زبانی فلسفہ اور مقرر کی شعلہ بیان تقریریں ایک محدود وقت کے لئے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہیں اور بہت زیادہ ہوا تو عقل ان کی صحت کو تسلیم کر لیتی ہے لیکن دلوں کو متاثر کرنے اور زندگیوں کی کایا پلٹنے کا عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک معلم کی تعلیم اور واعظ کا وعظ خود اس کی اپنی زندگی میں عملی طور پر رچا بسا نہ ہو۔

اللہ تعالی ہمیں اور ہمارے معلموں اور واعظوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس راز کو سمجھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی صحیح معنی میں پیروی کر سکیں ،آمین۔وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین (ماہنامہ البلاغ،جمادی الثانیۃ ۱۳۸۹ھ:۳۲۳۱۲)

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

(علامہ اقبال مرحوم)

مہتاب عالم قاسمی
مورخہ ۱/دسمبر ۲۰۱۶ء،مطابق یکم ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ

تمت بالخیر والعافیہ

طباعت:ہمدم پریس(وقف)،مالیگاؤں فون 02554-230503،موبائل 9370230503